ہوا کچھ یوں کہ

فائزہ افتخار

فہرست

ہوا کچھ یوں کہ

پتا نہیں اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟
وہ کوئی پہلی لڑکی تو نہیں تھی جس نے عمر اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے یہ حرکت کی تھی۔ روز کتنی ہی لڑکیاں اس کی عمر کی لڑکیاں، اس کے کالج کی ہم جولیاں اس کے سامنے ہی تو جایا کرتی تھیں اور اس کے سامنے ہی ہنستی مسکراتی آیا کرتی تھیں...... پھر اسی کے ساتھ کیوں؟
آخر کیوں؟
حالانکہ وہ پہلی بار ہی ...... پھر کیوں؟ جبکہ اس کی کئی فرینڈز پچھلے ڈیڑھ دو سالوں سے باقاعدہ اس معمول پہ کاربند تھیں۔ کم از کم ہفتے میں دو یا تین بار تو ضرور کلاسز بنک کر کے اپنے دوستوں کے ساتھ وقت گزاری کے لیے نکلا کرتیں۔
وقت گزاری...... ہاں اس کے نزدیک یہ وقت گزاری ہی تھی جسے اس کی ہم عمر، ٹین ایجر لڑکیاں پیار، محبت، لو، عشق یا رومان کے دل فریب نام دیا کرتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی بہت ہی روایت پسند گھرانے سے یا مڈل کلاس طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لیے اس راہ تک آتے آتے اسے اتنا وقت لگ گیا بلکہ اس کا مزاج ہی کچھ الگ قسم کا تھا ورنہ جس کلاس سے وہ تعلق رکھتی تھی وہاں بچپن کچھ زیادہ ہی جلدی رخصت ہو جاتا تھا۔ کم عمری میں ملنے والی غیر ضروری آسائشات کی وجہ سے......
وہ جس سکول میں تھی، وہ شہر کا ٹاپ کلاس کا ایجوکیشن تھا۔ برگر کلاس کے بچے ہی وہاں تک پہنچ پاتے تھے۔ اور یہ بچے اپنی ٹین ایج کے پہلے سال ہی میں الگ بیڈ رومز ان میں مہیا کردہ الگ کیبل اور انٹرنیٹ کنکشنز، پرسنل موبائل فون وغیرہ کی وجہ سے بھرپور بلوغت کے شب و روز جینے لگتے تھے۔ اس کی اکثر فرینڈز نائنتھ اسٹینڈرڈ میں ہی محبت...... کا شوق پالنے لگی تھیں۔ اس کی سب سے کلوز فرینڈ ضحیٰ پچھلے اڑھائی سالوں میں چار بار کسی نہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ان میں سے دو تو اسکول لائف میں ہی اس کے کلاس فیلوز

تھے۔ پھر اچانک اسے اپنا ماموں زاد اچھا لگنے لگا۔ جب وہ دونوں فرسٹ ایئر کے ایگزامز دے کر فارغ تھیں تو اس کا دل اپنے فادر کے بزنس پارٹنر کے اکلوتے بیٹے پہ آ گیا۔ فی الحال وہ چار ماہ سے اسی پہ قناعت کیے ہوئے تھی۔

اسے بھی گزرے کچھ دنوں میں کئی چہرے اچھے لگے۔ کئی لوگ دل کو بھائے مگر بات اس سے آگے بڑھ نہ سکی۔ وہ کوئی دبو، شرمیلی یا ڈرپوک قسم کی لڑکی نہیں تھی کہ اس حد سے آگے بڑھتے ہوئے گھبراتی...... اپنے والدین کی سختی سے خوفزدہ ہوتی، یا شکل کے معاملے میں گئی گزری تھی کہ لڑکے اس سے کتراتے۔ بس کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی یونہی اس کا پندرہواں اور پھر عمر کا سولہواں سال بھی گزر گیا۔

اور یہ اس کی سترہویں سالگرہ کی شام تھی جو اس نے اپنی فرینڈز کے اصرار پہ گھر میں پارٹی دے کر سیلیبریٹ کرنے کے بجائے کے ایف سی میں کی۔ کپلز کی صورت میں آنے کا آئیڈیا بھی ضحیٰ کا تھا اور چونکہ ساری فرینڈز اور کلاس فیلوز بوائے فرینڈز کے معاملے میں خود کفیل تھیں اس لیے کسی نے اعتراض نہ کیا مگر خود اسے اپنا آپ سخت گاؤدی لگا جب پوری پارٹی میں اس نے صرف اپنے آپ کو ہی اکیلا پایا۔ اس سے پہلے اس بات کو قطعاً اہمیت نہ دینے والی زونیرا کو پہلی بار کسی دوست کی کمی محسوس ہوئی۔ اسے پہلی بار عمر کے تقاضے نے اسے حسین ساتھ کی خواہش کے لیے اکسایا۔ وہ اندر ہی اندر خجالت محسوس کرتی سوچ رہی تھی۔

”کیا کہتی ہوں گی سب، زونیرا اتنی گئی گزری ہے کہ اس کو اب تک ایک بوائے فرینڈ تک نہیں مل سکا۔ وہ تو اس بات پہ کبھی یقین نہیں کریں گی کہ میں نے خود کتنے اسمارٹ لڑکوں کی دوستی کی آفر ٹھکرائی ہے۔ وہ تو یہی سمجھیں گی کہ مجھے ہی کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔“

یہ سب سوچتے ہوئے اس کی نظر اچانک شیراز پہ پڑی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

شیراز اس کے پاپا کے ایک قریبی دوست کا بیٹا تھا اور کافی عرصہ وہ لوگ ان کے پڑوسی بھی رہے۔ وہ چونکہ عمر میں اس سے چار پانچ سال بڑا تھا اس لئے بچپن میں ان کی زیادہ دوستی نہ ہو سکی ویسے بھی وہ شروع سے ہی دوستی کے معاملے میں خاصی سلیکٹڈ تھی۔ صرف ضحیٰ تھی جس سے اس کی دوستی کلاس پریپ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی باقی سب سے وہ ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر ملا کرتی۔ سکول تک یہی روش رہی ہاں کالج آ کر اس کا حلقۂ احباب کچھ وسیع ہوا تھا۔

شیراز اور اس کی فیملی پانچ سال تک انگلینڈ میں رہنے کے بعد حال ہی میں پاکستان لوٹے تھے۔ وہ اس وقت لنچ پیک کرواتے شیراز کو قطعاً نہ پہچان پاتی اگر اس دن پاپا کی جانب سے اس کی فیملی کو دیے جانے والے ڈنر میں اس سے ملاقات نہ ہوتی۔ شیراز نے اس سے بے تکلف ہونے کی خاصی کوشش کی تھی مگر وہ اسے سرد مہری سے ٹالتی رہی تھی۔

اسے یہ اچھا لگتا تھا کہ لڑکے اس کی جانب متوجہ ہوں، اس کی خوب صورتی کو سراہیں، اس سے دوستی

کرنے کی خواہش کا اظہار کریں، اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کریں۔ آخر کو وہ ایک سترہ سالہ خوب صورت، زندگی سے بھرپور شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ مگر اسے یہ پسند نہیں تھا کہ وہ خود کسی لڑکے کو اتنی اہمیت دے کہ وہ خود کو اس کا سب کچھ سمجھنے لگے۔ اس لیے کسی بھی لڑکے کی پیش قدمی کے جواب میں دل ہی دل میں خوش ہونے کے باوجود ایک سردمہری کی چادر خود بخود اس کے وجود پہ تن جایا کرتی تھی۔

شیراز بھی دال گلتی نہ دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا تھا مگر دور دور سے اس کا چور نظروں سے زونیرا کو دیکھنا، اسے مسرور کر رہا تھا۔ وہ خود کو ناقابل تسخیر جان کر خوش ہو جایا کرتی تھی۔

صرف آج اسے اپنا اکیلا پن کھل رہا تھا اور ایسے میں اسے شیراز نظر آ گیا۔ وہ سہیلیوں کی نظر بچا کے ٹیبل سے اٹھی۔ یوں بھی سب اپنے آپ میں مگن تھے۔

''آج میرا برتھ ڈے ہے۔ کیا تم ہمیں جوائن کرو گے؟''

اس نے بغیر کسی تمہید کے اسے انوائٹ کیا۔ شیراز نے ایک نظر لمبی سی ٹیبل کے گرد بیٹھے درجن بھر لڑکے لڑکیوں پہ ڈالی اور سارا معاملہ بھانپ گیا۔

''کیا تم اپنی فرینڈز کو بھی یہ بتاؤ گی کہ میں اچانک مدعو کیا جانے والا مہمان ہوں...... یا میری حیثیت کچھ خاص الخاص ہو گی؟''

اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے سوال کیا تو زونیرا خفیف ہو گئی۔ وہ چاہتی تو یہی تھی کہ شیراز جیسے شاندار شخصیت کے لڑکے کا تعارف اپنے قریبی اور خاص دوست کی حیثیت سے کرائے مگر اپنی غرض اس پہ ظاہر کرتے ہوئے اسے اپنا آپ ہلکا بھی لگ رہا تھا اس لیے گڑبڑا کے چپ ہو گئی۔ شیراز کو اس پہ ترس آ گیا۔

''کیونکہ میں نہیں چاہتا، بن بلایا مہمان بن کے جانے میں مجھے انسلٹ محسوس ہو۔ ٹھیک ہے تم اتنے پیار سے انوائٹ کر رہی ہو مگر وہ سب تو یہی سمجھیں گے کہ اتفاقیہ نظر آنے پہ تم نے کرٹسی میں مجھے بلا لیا ہے اور میں منہ اٹھا کے آ بھی گیا۔ اس لیے......''

اس نے سلیقے سے بات اپنے اوپر لے کر اس کی مراد پوری کر دی۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں تمہیں سرپرائز گیسٹ کے طور پر انٹروڈیوس کرواؤں گی۔'' اس کا بھی بھرم رہ گیا۔

وہ شام کئی حوالوں سے یادگار ٹھہری۔ وہ اپنی دوستوں کی رشک آمیز نظریں محسوس کر کے اتراتی رہی۔ شیراز کے لیے کہے گئے توصیفی کلمات میں بھی اسے اپنے لیے ستائش محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ چند گھنٹوں کی ملاقات میں ہی شیراز کے بے حد قریب بھی آ گئی۔ اس رات سونے سے قبل وہ دیر تک اسے سوچتی

رہی اور زندگی میں پہلی بار اپنے علاوہ کسی اور کو سوچنا اسے اچھا بھی لگا۔

☆

اگلے تین دن تک وہ بلاناغہ کئی گھنٹوں تک فون پہ باتیں کرتے رہے۔ تیسرے دن شیراز نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ ذرا ہچکچائی تھی...... یہ یقیناً اس کے لیے زندگی کا پہلا تجربہ ہوتا لیکن ایک تو وہ شیراز کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی دوسرا کچھ ہی دن پہلے وہ آڑے وقت میں اس کے کام آیا تھا اور اس اعلیٰ ظرفی کے ساتھ آیا تھا کہ اب تک اس نے سرسری سے انداز میں بھی یہ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''کیا تمہیں مجھ پہ اعتماد نہیں ہے؟''

اور بالآخر اس نے وہی مردوں کا پرانا حربہ آزمایا۔ اعتماد کی کسوٹی لے کر مقابل کو شرمسار کرنا چاہا۔ وہ بھی شرمندہ سی ہوگئی۔

''نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں سوچ رہی تھی کہ فون پہ ہم روز بات کر تو لیتے ہیں۔''

''صرف بات کرنے سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بے حد قریب سے۔''

شیراز کی آواز سرگوشیوں میں ڈھلی اور زونیرا کے نوعمر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔

''میں ہر سیٹر ڈے نائٹ کو جم خانہ جاتی ہوں، آجانا تم بھی۔''

''ہاں پتا ہے، جاتی ہو اور وہ بھی ساری فیملی کے ساتھ، میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں زونی...... اکیلے میں۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''چھپ چھپ کر اکیلے ملنے میں جو ڈرا سہا سا مزہ ہے، وہ یوں سب کے درمیان ملنے میں کہاں۔ سنا ہے پیار کرنے والے یونہی ملا کرتے ہیں۔''

اس نے زونیرا کو بے بس کرنے کے لیے ایک اور وار کیا۔ یہ اس کی جانب سے پہلا واضح اظہار محبت تھا۔ وہ چاروں شانے چت ہوگئی۔

''میں آؤں گی۔''

''کل صبح گیارہ بجے میں تمہیں تمہارے کالج کے گیٹ سے پک کروں گا۔''

نا ہی زونیرا نے یہ پوچھا کہ وہ اسے کہاں لے جائے گا نہ اس نے بتانا ضروری جانا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی لڑکے سے دوستی یا افیئر کا اس کا یہ پہلا تجربہ تھا مگر وہ کوئی اتنی بھی سیدھی یا گھر میں بیٹھنے والی لڑکی نہ تھی۔ اسے کوئی خاص ڈر یا خوف محسوس نہ ہوا۔ اس کے والدین خاصے آزاد خیال اور ماڈرن تھے۔ وہ اگر اپنی مام کو بتا کر بھی جاتی تو شیراز کا نام سن کر وہ کوئی اعتراض نہ کرتیں۔ مگر چھپ چھپ کر ملنے والے ایڈونچر کا مزہ وہ بھی لینا چاہتی تھی۔ اس کے محض تصور سے ہی اس میں ہیجان برپا ہو رہا تھا۔

اور پھر وہ ہو گیا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

گھر سے نکلتے ہوئے اس نے ایک بار یہ سوچا ضرور تھا کہ ہوسکتا ہے شیراز اسے جس ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے لے کر جائے، وہیں پاپا بھی آئے ہوں یا جس پارک میں لے کر بیٹھے وہاں اس کا بھائی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ موجود ہو۔ مگر پھر اس نے یہ سوچتے ہوئے اس خیال کو جھٹک دیا تھا کہ ''دیکھا جائے گا۔''

وہ دن...... جو ایک عام سا دن تھا۔ دوسرے بہت سے عام دنوں جیسا عام...... مگر جو زونیرا کو بہت خاص لگ رہا تھا اور وہ اسے خاص تر بنا دینا چاہتی تھی اس لیے رات کو ہی اس نے مکمل تیاری کر چھوڑی تھی۔ وہ اپنے خاص پارلر سے فیشل کروا کے آئی تھی۔ اپنا سب سے خوبصورت لباس منتخب کر کے نکالا تھا۔ دوسری جانب تقدیر بھی بھرپور تیاریاں کر رہی تھی اس دن کو اس کی زندگی کا خاص دن بنانے کے لیے۔

''تم آج کالج نہیں گئیں؟''

ناشتے کی ٹیبل پہ اس کے پاپا نے اس کی موجودگی کا نوٹس لیتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے آج کچھ لیٹ جانا ہے...... فنکشن ہے۔'' اس نے نظر ملائے بغیر ٹوسٹ پہ مارجرین لگاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''اوہ گاڈ، میری کار تو ابھی دو دن اور ورکشاپ میں رہے گی۔ میرا خیال تھا ڈرائیور تمہیں کالج ڈراپ کر آئے گا تو میں اسی کے ساتھ شاپنگ پہ چلی جاؤں گی۔ تمہارا کالج آف ہونے پہ میں اسے آدھے گھنٹے کے لیے بھیج دوں گی، مجھے ایک جگہ اور بھی...... لیکن اب پتہ نہیں تمہارا فنکشن کب شروع اور کب ختم ہوگا۔''

اس کی ماما اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''آپ کار لے جائیے۔ میرا فنکشن شام تک چلے گا۔ میری کوئی نہ کوئی فرینڈ مجھے گھر ڈراپ کر دے گی اور یہاں سے میں کوئی ٹیکسی......''

''آج تم میرے ساتھ چلو۔''

اس کے پاپا نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہر وقت ایسے ہی جلدی میں رہتے تھے۔ پراپرٹی کے بزنس سے وابستہ تھے جو ویسے ہی کافی عرصے سے زوروں پہ تھا مگر اب پچھلے دو تین سالوں سے تو جیسے وہ مٹی کو چھو کر سونا بنا رہے تھے۔

زونیرا کو شیراز سے ملنے جاتے ہوئے اپنے پاپا سے لفٹ لینا بھی ایک ایڈونچر ہی محسوس ہوا۔

اور جب وہ اسے کسی پارک، ریسٹورنٹ یا لانگ ڈرائیو پہ لے جانے کے بجائے ایک گیسٹ ہاؤس میں لے آیا تو یہ بھی اسے کسی ایڈونچر سے کم محسوس نہیں ہوا۔

آنے سے پہلے جو تھوڑی بہت جھجک اسے محسوس ہو رہی تھی وہ راستے میں شیراز کی پر لطف اور

بے تکلفانہ گفتگو نے دور کر دی تھی۔

''ہم یہاں کیوں آئے ہیں شیری؟''

''کیونکہ یہاں کا ماحول بہت پُرسکون اور گھر جیسا ہے، یوں بھی کسی ریسٹورنٹ میں جانے کے لیے دن کے دس بجے کا وقت مناسب نہیں ہے۔ لنچ ٹائم میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے، تب تک کچھ دیر آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔ کیوں تم ڈر رہی ہو؟'' اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''نہیں...... ڈر کیسا؟'' زونیرا نے شانے اچکائے۔ اپنے وسوسوں کا اظہار کر کے وہ خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی...... اور نہ ہی کوئی عام لڑکی۔

''مجھ پہ اعتبار نہیں ہے کیا؟''

''تم پہ نہ ہو، مجھے خود پہ پورا اعتماد ہے۔'' اس نے چیلنج کرتی نظروں سے اسے جتا کر کہا اور اس کے اترنے سے پہلے خود اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نکل آئی۔

ابھی انہیں گیسٹ روم کے اس سجے سجائے، ویل فرنیشڈ، ایئر کنڈیشنڈ روم میں آئے بمشکل آدھا گھنٹہ ہوا تھا۔ ابھی تو وہ شیراز کا آرڈر دیا ہوا مشروب گھونٹ گھونٹ پی رہی تھی اور شیراز ریموٹ ہاتھ میں لیے کوئی میوزک چینل تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب انہیں کسی افراتفری کا سا احساس ہوا۔

وہ اگلا سپ لینا بھول گئی اور کان باہر کی جانب لگا دیے۔ اچھے بھلے پرسکون خاموش ماحول میں یکا یک بہت سے لوگوں کے تیز تیز چلنے یا بھاگنے کی آوازیں...... دروازے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ وہ حیران ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جب وہ لوگ اندر آ رہے تھے تو گیسٹ ہاؤس کے باہر کوئی درجن بھر گاڑیاں کھڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اس کے باوجود وہاں پن ڈراپ سائلنس تھا۔ کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا جیسے بند دروازوں کے پیچھے کوئی ذی روح موجود نہ ہو اور اب......

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے شیراز کی جانب دیکھا تو اس کی حالت دیکھ کر اور بھی سراسیمہ ہو گئی۔

وہ تو صرف حیرت زدہ تھی جبکہ شیراز خوف زدہ تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریموٹ گر چکا تھا۔ گھبرائے ہوئے انداز میں وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے بھاگنے کی راہ تلاش کر رہا ہو اور اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر زونیرا کو بھی عدم تحفظ کا احساس ہوا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے شیری؟...... یہ شور......؟''

''آئی تھنک زونی...... کہ پولیس کی ریڈ ہوئی ہے۔''

یہ سنتے ہی زونیرا کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔

''مم ......مگر شیری کیوں؟ پولیس کیوں؟'' ایک پراعتماد، آزاد خیال نئے زمانے کی لڑکی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اب وہی عام سی، ڈرپوک، آنسو بہانے والی لڑکی کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ زرد چہرہ لیے سوال کر رہی تھی۔ اور جب شیراز کو موبائل فون استعمال کرنے کا خیال آیا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، ابھی اس نے بیڈ پر لاپروائی سے پھینکا ہوا اپنا سیل فون اٹھا کر اپنے اثر و رسوخ والے باپ کا نمبر ملانا ہی چاہا تھا کہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھل گیا۔

سامنے چھ سات کرخت صورت پولیس اہلکاروں اور کیمرے سمیت دو تین رپورٹرز کو دندناتے ہوئے اندر آتا دیکھ کر زونیرا کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں

ایک نے لپک کے شیراز کے ہاتھ سے سیل فون چھینا، دوسرے نے اس کے ہاتھ مروڑ کے پشت کی جانب باندھ دیے۔

''تم جانتے نہیں ہو میرے ڈیڈی کون ہیں......ارے تمہاری تو......ایک ایک کو دیکھ لیں گے وہ۔''

تابڑ توڑ تھپڑوں کے جواب میں وہ مسلسل گالیاں دیتا اور دھمکاتا جا رہا تھا مگر ایس ایچ او اس کے ڈیڈی کا تعارف جاننے کے موڈ میں نہیں لگ رہا تھا۔ جب اس کی گالیاں نہ رکیں تو اس نے محض تھپڑوں پہ اکتفا نہ کرتے ہوئے شیراز کے پیٹ میں اپنا گھٹنا رسید کیا۔ وہ درد سے کراہتا ہوا دوہرا ہو گیا۔

''پتا ہے، بہت بڑے باپ کی اولاد ہو اسی لیے یہاں موجود ہو۔ کسی ماڑے بندے کے بچے کی کیا اوقات جو وہ ان بدنام کوٹھیوں میں ہزاروں روپیہ دے کر صرف ایک گھنٹے کے لیے کمرہ بھی حاصل کر لے اور ایسی مہنگی عیاشیاں بھی......''

اس نے لال لال آنکھیں دیوار سے چپکی زونیرا پہ گاڑتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے جیسے امیر زادوں کے ہی چونچلے ہیں۔ غریب بندہ تو سو پچاس والی ٹھرک پر ہی خوش ہو جاتا ہے۔ ایسی دس ہزار، بیس ہزار وصولنے والی تتلیاں اس کے نصیب میں کہاں۔''

زونیرا پوری شدت سے چلا کر اس کے اندازے کی تردید کرنا چاہتی تھی کہ وہ، وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہا ہے۔ وہ تو شیراز کے باپ سے بھی کہیں بڑے شخص کی بیٹی ہے۔ مگر اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کے رہ گئی تھی۔ شیراز نے بھی مزید مار سے بچنے کے لیے مارے ڈر کے دوبارہ منہ نہیں کھولا تھا۔ پھر وہ کانسٹیبل اسے لاتیں مارتے، دھکے دیتے کمرے سے باہر لے جانے لگے۔ ایک لیڈی کانسٹیبل نے اسے بالوں سے پکڑا اور بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر کی طرف بڑھنے لگی۔

اب بھی زونیرا کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی تھی صرف اس کی وحشت زدہ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس کی قیمتی امپورٹڈ سینڈل اندر کمرے میں ہی رہ گئی تھی۔ اس کے اسٹائلش ڈریس کا برائے

نہ ... دوپٹہ دروازے کے قریب گرا رہ گیا تھا۔ اس کے سلیولیس گورے بازوؤں پہ ناخنوں کی کھرونچیں لگ چکی تھیں۔ حالانکہ اس نے مزاحمت کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی تھی مگر اس لیڈی کانسٹیبل کی گرفت ہی ایکی وحشیانہ تھی۔ وہ مڑی ہوئی گردن اور جھکی ہوئی کمر کے ساتھ کسی بندھے ہوئے جانور کی طرح اس کے پیچھے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ سب کمروں سے مرد اور عورتیں اسی طرح نکالے اور ہانک کے لے جائے جا رہے تھے۔ جو مزاحمت کی کوشش یا اپنے حوالے دینے کی جسارت کر رہے تھے ان پہ مکوں، لاتوں کا بے دریغ استعمال ہو رہا تھا۔

پھر بند گاڑی میں مویشیوں کی طرح ٹھونسے جانے کے دوران ایک رپورٹر ان کی چند تصویریں لینے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔

☆

''میئر صاحب کے خاص آرڈر پہ ہمارے محکمے نے شہر کے پوش علاقوں میں بنے ان عیاشی کے اڈوں کے خلاف آپریشن شروع کیا ہے جن کو گیسٹ ہاؤس کا نام دیا جاتا ہے جبکہ درپردہ یہاں جوڑوں کو عیاشی کے لیے چند گھنٹوں کے لیے ہزاروں روپیہ کے عوض پُرآسائش کمرے مہیا کیے جاتے ہیں اس سے نہ صرف معاشرے میں بے راہ روی پھیلتی ہے بلکہ اس علاقے کے دیگر شریف شہریوں کے لیے بھی یہ امر باعث تشویش تھا۔ یہ شریف شہری ان گیسٹ ہاؤسز کے مالکان کے خلاف آواز اس لیے نہیں اٹھا سکتے کیونکہ یہ باقاعدہ ایک مافیا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی عام شخص نہیں۔ یہ اب ایک بزنس کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایک گھناؤنا منافع بخش بزنس۔ دوسرے گیسٹ ہاؤس کی طرح اس گیسٹ ہاؤس کا مالک بھی ایک اہم شخصیت ہے جس کا نام فی الحال پریس پہ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔''

ایس ایس پی ہاشم سعید نے پریس کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔

''سر! ایک سوال اور.....'' ایک لیڈی رپورٹر اس کو اٹھتے دیکھ کر جلدی سے بولی۔

''یہ جو خواتین اور حضرات اس وقت لاک اپ میں نظر آ رہے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

''دیکھیں، برائی کی اصل جڑ تو یہی ہیں۔ اگر گناہ کرنے والے نہ رہیں گے تو گناہ کی دعوت دینے والے کہاں جائیں گے۔ ہم ان کے خلاف سخت ایکشن لینے والے ہیں اور ان پہ قانون کے مطابق کیس چلے گا۔''

''ان میں کچھ کم عمر لڑکیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ دھوکے سے یا غلط بیانی سے کام لے کر یہاں لائی گئی ہوں، یہ بھی ممکن ہے ان کا تعلق باعزت اور شریف گھرانوں سے ہو کیا ان کے ساتھ رعایت نہیں کی جائے گی؟ کیا ان کے والدین کو بلوا کر، انہیں سخت وارننگ دیتے ہوئے ان کے حوالے نہیں کیا جا سکتا؟''

''دیکھیں بی بی! اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم پہ رشوت لینے یا سفارش ماننے کا الزام لگانے والے بھی آپ لوگ ہوں گے اور آپ ان کی شکلوں پہ نہ جائیں۔ یہ ایسے ہی باعزت اور شریف گھرانوں سے ہوتیں تو اپنے گھروں میں بیٹھی ہوتیں، یہاں نظر نہ آتیں۔ ان کے خلاف سخت کارروائی ہوگی اور کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی۔ پھر آپ لوگ کہتے ہیں کہ پولیس اپنا کام صحیح نہیں کرتی۔''

صحافی کے سوال پہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی زونیرا کو کچھ امید بندھی بھی تھی تو اس آفیسر کے درشت جواب پہ وہ بھی دم توڑ گئی۔

اس سمیت سب ہی افراد کے والٹ اور سیل فون پولیس کے قبضے میں تھے۔ وہ منتظر تھی کہ کب اس کے گھر والوں سے رابطہ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے ماما پاپا کا ری ایکشن کیا ہوگا مگر جو بھی تھا، وہ اس صورتحال سے زیادہ خطرناک اور ڈراؤنا تو نہیں ہوسکتا تھا۔

صحافیوں کے نکلتے ہی کارروائی کا آغاز کیا گیا اور یہ کارروائی اس کارروائی سے قطعاً مختلف تھی جس کا دعویٰ پریس کے سامنے کیا گیا تھا۔ گرفتار ہونے والے آٹھ مردوں میں سے سب سے تگڑی آسامی کو پہلے آگے لایا گیا اور اب اس سے معاملات نمٹائے جارہے تھے۔ باقی اپنی باری کا انتظار کررہے تھے کہ کب انہیں ان کی بدنامی کی قیمت بتائی جائے گی۔ ان میں شیراز بھی شامل تھا۔

اور وہ باقی عورتوں کے ساتھ ٹھنڈے فرش پہ بیٹھی تھی۔ وہ عورتیں جو اس جیسی نہیں تھی نہ وہ ان سب جیسی تھی ان کے لیے شاید یہ لاک اپ، یہ چھاپہ سب معمول کی بات تھی۔ وہ زمین پہ پھسکڑا مارے بیٹھی اپنے اپنے پچھلے تجربات بیان کررہی تھیں کہ پچھلی بار کتنے گھنٹوں کے بعد یہاں سے چھوٹیں، اور کس کی سفارش پہ۔

چونکہ یہاں سے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی اس لیے انہیں اب تک طلب نہیں کیا گیا تھا۔

''میں ان میں سے نہیں...... میں کوئی پیشہ ور طوائف نہیں، میں کوئی جسم فروش عورت نہیں، میں گناہ گار نہیں پھر میں یہاں کیوں ہوں؟''

یہ سوال پھر اسے چبھنے لگا۔

''ہاں میں نے غلطی کی...... مگر یہ غلطی ہر روز میرے ساتھ کی درجنوں لڑکیاں دُہراتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی اپنے باپ اور بھائی کی نظر میں آجاتی ہوگی۔ لیکن میرے ساتھ ایسا ہوتا تب شاید کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ پاپا مجھے شیری کے ساتھ دیکھ لیتے یا ماما تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا؟ ہاں مجھے شیری کے ساتھ اس گیسٹ ہاؤس میں نہیں آنا چاہیے تھا، میں نے غلطی کی...... ضرور کی لیکن یہ غلطی میری کئی دوستیں کب سے کررہی ہیں۔ پھر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ وہ بھی پہلی بار جبکہ میں نے اس کے علاوہ کوئی غلطی، کوئی گناہ نہیں کیا؟ پھر کیوں...... آخر میں ہی کیوں؟''

اس کے ان سوالوں کا جواب دور...... کافی دور موجود تھا۔

☆

آج دن کا آغاز ہی بہت برا ہوا۔

صرف اس شہر میں ہی اس کے دو گیسٹ ہاؤس تھے، جن میں سے ایک پہ چھاپے کی اطلاع اسے صبح ہی مل گئی۔ اس نے دوسرے گیسٹ ہاؤس میں رابطہ کر کے اسے فوراً بند کروایا۔

''پورے سٹاف کو چھٹی دے دو...... کم از کم ایک ہفتے کی اور آفس سے سارا ریکارڈ غائب کر دو...... خود بھی جلد از جلد نکل جاؤ اور جب تک میں آرڈر نہ دوں، گیسٹ ہاؤس دوبارہ نہ کھولنا۔''

دوسرے شہروں میں واقع دیگر اڈوں پہ بھی فون کر کے صورتحال کا جائزہ لیا مگر وہاں حالات قابو میں تھے۔ پھر بھی منیجرز کو محتاط رہنے کی ہدایت کی۔

پھر وہ دیر تک فون پہ اپنے ایسے دوستوں اور تعلق داروں سے رابطے میں رہا جن کی پہنچ اوپر تک تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے سر کھپانے کے بعد یہ ہوا کہ مل ملا کے پولیس پہ جو دباؤ ڈالا گیا اس کے نتیجے میں چند لاکھ پہ معاملہ نمٹ گیا تھا۔ اس نے اپنا نام ریکارڈ میں آنے سے روک دیا تھا۔

''ان کے آگے جب تک کچھ پھینکو نہیں، یہ ٹلتے بھی نہیں ہیں...... سارا دن برباد کر کے رکھ دیا، پچیس لاکھ کا چونا لگا وہ الگ...... ایک گیسٹ ہاؤس ہاتھ سے گیا وہ الگ۔''

وہ اپنے ایک قریبی دوست سے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔ کئی گھنٹوں کی بھاگ دوڑ میں نہ اسے کھانے کا ہوش رہا نہ پینے کا۔ اب معاملہ کنٹرول میں ہونے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو کے اس کے ساتھ ایک فائیو سٹار میں ہائی ٹی لینے جا رہا تھا۔

''ہاتھ سے کیا گیا...... اس کوٹھی کو بیچ دینا اور کسی اور اچھے سے ایریا میں اس سے زیادہ اچھا بنگلہ لے کر دوبارہ کام شروع کر دینا۔ یہ بھی کوئی پرابلم ہے؟ تم تو ایکسپرٹ ہو چکے ہو اس بزنس میں۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ مارکیٹ میں ساکھ بنانی پڑتی ہے۔ میرے گیسٹ ہاؤس کے بارے میں یہ بات کنفرم ہوتی تھی کہ یہاں کوئی مائی کا لال ہاتھ نہیں ڈال سکتا اس لیے بڑی سے بڑی پارٹی بھی بغیر کھٹکے یہاں آتی تھی۔ اب میرا ریکارڈ خراب ہو گیا ہے۔ نئے علاقے میں نیا گیسٹ ہاؤس نئے ریگولر کسٹمر بننے میں بھی وقت لگتا ہے۔ سوچتا ہوں اب بنگلے خریدنے کی بجائے کرائے پہ لیا کروں۔ اگلے کسی کیس کی صورت میں میرا نام نہیں آئے گا۔''

''ویسے دیکھا جائے تو یہ کام ہے منافع بخش۔ ہوٹل تو جب تک بڑے پیمانے پہ نہ کھولا جائے فائیو سٹار قسم کا۔ تب تک یہ وارے نیارے نہیں ہو سکتے جو تم ایک ایک کنال کے بنگلے میں دس دس بیڈ رومز

کے گیسٹ ہاؤس کھول کے حاصل کر لیتے ہو۔ ایک کمرے کا ایک گھنٹہ کا کرایہ، کسی بھی فائیو سٹار ہوٹل کے سپر لگژری وی آئی پی روم کے چوبیس گھنٹوں کے کرائے کے مساوی......کمال ہو گیا۔'' اس کے دوست نے داد دی۔

''کیا کریں یار......!'' اس نے انکساری کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

''اولاد کو ایک خوشحال زندگی دینے کے لیے ایسے کمال کرنے ہی پڑتے ہیں۔''

''مگر پچیس لاکھ کی رشوت دے کر بھی اگر تمہارا نام کیس میں درج ہو گیا تو پھر؟...... پریس والے بھی تو پہنچ گئے تھے؟'' دوست نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں اتنا کچا کام نہیں کیا میں نے۔ اوہو ایک تو سخت گرمی، اوپر سے یہ مال روڈ کے ٹریفک سگنلز......''

اس نے اشارے پہ گاڑی روکی۔

''پچیس لاکھ کم نہیں ہوتے اور جو مرغے انہوں نے وہاں بند کمروں سے شکار کیے ہیں، وہ بھی کم موٹے مرغے نہیں۔ ان کی بھی خوب کھال اتاریں گے یہ پولیس والے۔ ایک ایک سے لاکھوں وصول کریں گے۔ اوئے چھوٹے اخبار دینا۔''

اس نے تین روپے دے کر شام کا اخبار خریدا جو سارے دن میں ہونے والی ہنگامہ خیز خبریں چٹ پٹے افسانوں کے ساتھ سب سے پہلے چھاپ کر ہر شام کو سنسنی خیز بناتا تھا۔

فرنٹ پیج پہ ہی گیسٹ ہاؤس پہ چھاپے کی خبر تھی۔ اس نے سرخی پڑھ کر ہی فاتحانہ اندازم میں اپنے دوست کی جانب اخبار بڑھایا۔

''یہ دیکھو، صاف لکھا ہے کسی نامعلوم شخص کی ملکیت تھا یہ گیسٹ ہاؤس جس کا سراغ لگانے میں پولیس ناکام رہی اور ہمیشہ ناکام ہی رہے گی۔''

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور نشاندہی کے لیے اپنے دوست کو خبر پہ انگلی رکھ کے دکھانے لگا..... اور ایسا کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر اس سرخی کے اوپر چھپی تصویر پہ جم گئی۔

تصویر میں ایک لحیم شحیم لیڈی کانسٹیبل ایک نوعمر گھبرائی ہوئی لڑکی کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے بند ٹین میں بیٹھا رہی تھی۔ لڑکی کا چہرہ تصویر میں بے حد واضح تھا اور نیچے درج تھا۔

''گیسٹ ہاؤس کی آڑ میں کھلے بدکاری کے اڈے سے گرفتار کی جانے والی ایک فاحشہ۔''

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ تصویر اس کی سترہ سالہ بیٹی زونیرا کی تھی۔

......❁......

ایک مرد تین کہانیاں

''سجل ڈارلنگ! پلیز......'' اس کے پیہم اصرار پہ زچ ہوتے ہوئے وہ سخت لہجے میں نرم الفاظ کے ساتھ سمجھانے لگا۔

''پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می......''

روٹھی روٹھی سی سجل رخ موڑ کر اس کا کوٹ ہینگر سے اتارنے لگی۔

''آپ تو یوں بات کرتے ہیں جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔ نیلم، انیتا، زارا وغیرہ سب ان پارٹیز میں ٹھاٹھ سے شریک ہوتی ہیں اور آپ کے سب دوست...... وہ مظہر کیانی اور وہ پینڈو بھٹی وہ بھی اپنی فیملی لے کر ہر جگہ پہنچا ہوتا ہے۔ نجانے آپ پہ یہ دقیانوسیت کیوں سوار ہوگئی ہے لے کر قید ہی تو کر دیا ہے مجھے اس گھر میں۔''

برہمی اس کے ہر انداز سے واضح تھی، ایک جھٹکے کے ساتھ کوٹ کھینچ کر نکالنے میں بھی...... اسے پہنانے میں مدد کرنے میں بھی اور پرفیوم کا سپرے اندھا دھند کرنے میں بھی...... وارث نواز علی نے بے اختیار مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''سارا غصہ اس پرفیوم پہ نکالو گی؟'' پھر اسے شانوں سے تھام کر اپنے روبرو کیا۔ چھ فٹ سے بس ایک آدھ انچ کم اس کے لمبے چوڑے وجود کے آگے سجل ہمیشہ کی طرح بونی سی محسوس ہوئی۔

''جانو! تمہیں یہ احساس کیوں ہوا کہ میں نے تمہیں گھر میں قید کر رکھا ہے۔ تمہاری اپنی لائف ہے، ایکٹیویٹیز ہیں...... میں نے کبھی اس میں داخل دیا۔ میں تو ہمیشہ تمہیں ایپری شیٹ کرتا ہوں کہ کس طرح تم نے گھر اور اپنی سوشل لائف کو بیلنس رکھا ہوا ہے۔ تم اپنی فرینڈز کے ساتھ آؤٹنگ پر جاؤ شاپنگ کے لئے نکلو، پارلر، بوتیک، پارٹیز، این جی اوز...... اچھی خاصی بزی تو رہتی ہو پھر یہ الزام کیوں اس ناچیز پہ...... ہر سال تمہیں فارن ٹرپ پر بھی لے جاتا ہوں۔ اتنے ٹف شیڈول کے باوجود ایک دو بار فیملی ڈنر بھی ہو جاتا ہے کسی فائیو اسٹار میں۔ میرا تو خیال ہے میں اپنی ہمت سے بڑھ کر ہی کوشش کرتا ہوں، تمہیں زیادہ سے زیادہ ٹائم دینے کی۔

جہاں تک ان پارٹیز کی بات ہے تو مائی سویٹ ڈارلنگ وائف......! یہ سراسر بزنس میٹنگز ہوتی ہیں، ان میں فیملی کا کیا کام اور یہ جو تم نے نام گنوائے ہیں تو فار یور کائنڈ انفارمیشن ......ان کپلز کی تو ملاقات ہی پارٹیز میں ہوتی ہے۔اسی بہانے یہ لوگ ایک دوسرے سے مل لیتے ہیں ورنہ کہاں ٹائم ہوتا ہے، ہر کسی کے پاس اپنی بیویوں کے لئے۔''

''ہاں سارے جہان سے اچھے تو آپ ہیں نا۔ مجھے بہلانے کی کوشش مت کریں۔ میں سب جانتی ہوں۔''

وہ بدستور روٹھے روٹھے لہجے میں بولی تو رسان سے سمجھاتے وارث نواز کو بھی غصہ سا آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ہیئر برش ڈریسنگ پر پھینکتے ہوئے کہنے لگا۔

''تم کچھ نہیں جانتیں۔ نیلم، زارا تمہاری اتنی کلوز فرینڈز ہیں پھر بھی تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔بس یہ فرق ہے تم میں اور ان میں۔ایک ہی کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود تمہاری معصومیت اب تک برقرار ہے اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ جانتی ہو یہ سب سج سنور کر اپنے اپنے شوہر کے ساتھ ان پرٹیز میں کیوں شریک ہوتی ہیں......ان کی ویلیو بڑھانے کے لئے۔''

''واٹ......؟'' سجل نے اس قسم کی ڈیلنگز کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن یہ بات اس کے لئے صدمہ ہی تھی کہ اس کی فرینڈز میں سے بھی کوئی گھناؤنے کھیل کا حصہ ہے۔

''وہ زارا عنایت حسین، جو آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ ہے اور لاہور کے سب سے مہنگے پرائیویٹ کالج کی وائس پرنسپل ہے وہ جوان کے پورے گروپ میں سب سے ڈیسنٹ، سب سے سوبر ہے اور جسے اپنے شوہر کے بزنس ٹائیکون ہونے سے کوئی سروکار نہیں۔ اور وہ نیلم صفدر شیخ جو قابلیت کے لحاظ سے ایل ایل بی ہے، مگر پریکٹس نہ کرنے کے باوجود اپنی این جی او کے ذریعے عورتوں کو انصاف دلانے کے لئے کوشاں رہتی ہے اور وہ انیتا شیروف اٹالین نژاد کرسچن کراچی کے ایک پارسی شیروف بھائی سے شادی کر کے پاکستان میں ہی رچ بس گئی ہے۔ انیتا جو خود کو اٹلی کے رائل طبقے کا فرد کہتی ہے اور جس کے شاہانہ انداز و اطوار اس کی تصدیق کرتے ہیں وہ انیتا...... کیسے......؟ کس طرح؟

''میں یہ نہیں کہتا، سب ہی اپنی بیویوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ بھٹی ہے، مظہر ہے...... سب صاف ستھرا بزنس کرتے ہیں میری طرح لیکن سجل! ان پارٹیز کا ایک امیجن چکا ہے۔ جو بھی بیوی کے ساتھ آئے دوسرے اس کے بارے میں ایسے ہی اندازے لگاتے پھرتے ہیں۔ اچھی بھلی گھریلو سی عورت کو بھی چارہ سمجھ کر منڈلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ضبط کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلے ہفتے اچھا خاصا پھڈا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اباسین کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر مسز مظہر پہ تقریباً لٹو ہی ہو گیا۔ خاصی بدمزگی ہوئی، میرا

خیال ہے اب مظہر کو عقل آ گئی ہو گی۔ میں نے اسے ایک دو بار اشاروں کنایوں میں سمجھانے کی کوشش کی تھی، کیانی اور بھٹی کی دیکھا دیکھی وہ اپنی مسز کو ساتھ نہ لے آیا کرے۔ میں جانتا ہوں وہ اندر سے کتنا کنزرویٹو ہے وہ ماڈ بننے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن ہے نہیں۔

کیانی کی بات اور ہے، اس نے اس عمر میں آ کر شادی کی ہی اس مقصد کے تحت ہے۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بے غیرت بھی جبکہ بھٹی کا معاملہ اور ہے۔ تم جانتی ہو اس سے دوستی بزنس کی بنیاد پہ ہوئی ورنہ وہ میرے ایج گروپ کا نہیں، ظاہر ہے اس کی وائف بھی بس...... یونہی سی ہے وہ تو اگر خود اسے آگے بڑھائے تب بھی کوئی دلچسپی نہ لے۔ اب تم ہی بتاؤ تم جیسی بیوی کو ایسی جگہ لے جا کر کیا میں نے فساد ڈلوانا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، تمہارے معاملے میں میں کتنا پُچی ہوں کسی نے تمہیں ایسی ویسی نظر سے دیکھا بھی تو ضائع ہو جائے گا میرے ہاتھوں، بہتر یہی ہے کہ تم ان فضول پارٹیز سے اجتناب ہی کیا کرو جو جگہ تمہارے لائق ہے وہاں میں تمہیں لے بھی جاتا ہوں اپنے فرینڈز کی طرف، فیملی پارٹیز میں...... سب میرے قابل اعتماد یار دوست ہوتے ہیں تمہیں میرے حوالے سے عزت اور پروٹوکول دیتے ہیں جبکہ ان پارٹیز میں ایک سے ایک کرپٹ آفیسر ہوتا ہے۔ تم جیسی آفت قیامت بیوی کو لے کر میں اپنے پاؤں پہ خود ہی کلہاڑی ماروں گا۔''

''وارث! آپ بھی بس۔'' وہ اس کے حرف حرف پہ ایمان لاتے ہوئے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

''شادی کے آٹھ سال بعد اور دو بچوں کی ماما ہونے کے باوجود میں آپ کو آفت قیامت لگتی ہوں؟'' سوال میں استفسار کم اور اپنی تعریف زیادہ سے زیادہ سننے کی ہوس تھی۔

''اور ڈارلنگ......!'' وہ تو جیسے فدا ہی ہو گیا اس معصوم انداز پہ۔

''جان! تم نے خود میں کوئی کمی بھی تو نہیں آنے دی جو میری دیوانگی کم ہوتی۔ بالکل پہلے جیسی ینگ، فریش، اسمارٹ اور پریٹی ہو۔ آج بھی تم لاکھوں بلکہ کروڑوں کو مات دیتی ہو۔ میں یونہی تو دیوانہ نہیں ہوا تھا تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے بعد۔''

گزرے دنوں کی اس کی وارفتگی یاد آتے ہی سجل کے انداز میں اور بھی غرور آ گیا۔ واقعی کم پاپڑ نہیں بیلے تھے وارث نے اس سے شادی کے لئے۔ ایک تو کلاس ڈفرنس۔ اگرچہ وہ بھی کوئی گرے پڑے خاندان سے نہیں تھی، ملتان کے زمیندار گھرانے سے تعلق تھا۔ لیکن وارث لاہور کے ایک کلچرڈ، ماڈ اور ایجوکیٹڈ گھرانے سے تھا جو مربعوں، حویلیوں سے کم ہی مرعوب ہوتے تھے۔ وہ لاہور پڑھنے کی غرض سے آئی تھی۔ لیکن وارث کی زندگی میں آنے کے بعد یہی شہر اس کا مسکن ٹھہرا۔ آٹھ سالوں کے دوران اس بزنس مائنڈڈ فیملی کے اندر رچ بس جانے کے باوجود اس کے اندر کا وہ مخصوص ''بی بی جی'' والا اسٹائل نہیں بدلا تھا۔ آج بھی وہ وارث کی آنکھوں سے دیکھتی، اس کے کانوں سے سنتی اور اسی کے دماغ سے سوچتی تھی۔

''بیگم صاحبہ! وہ ڈرائی کلین والا آیا ہے، کپڑے دے دیں۔'' نچھو کی آواز پہ سجل کے شانوں پہ باہیں پھیلائے وارث بدمزہ ہو کر پلٹا۔

''اسٹوپڈ، جنگلی ......! تمہیں ابھی تک اتنے مینرز نہیں آئے کہ کسی کے بیڈ روم میں داخل ہونے سے پہلے دستک دینی چاہئے۔'' وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں اس کی طرف لپکا۔ سولہ سترہ سالہ نچھو سہم کے پیچھے ہوئی اور ادھ کھلے دروازے سے جا ٹکرائی۔

''کول ڈاؤن ہنی! نئی نئی آئی ہے، ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ ٹرینڈ ہو جائے گی۔ چلو نچھو! یہ صاحب کے کپڑے اٹھاؤ اور وہاں ڈریسنگ روم میں بھی میں نے باسکٹ میں نکال کر رکھے ہیں وہ بھی لے جاؤ'' سجل اسے آرڈر دینے کے بعد وارث کے لئے ٹائی منتخب کرنے لگی۔

''ٹریننگ دینے سے پہلے انہیں کمروں میں گھسنے ہی کیوں دیتی ہو۔'' وارث کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

''بائی داوے اس نمونے کو پکڑا کہاں سے ہے؟''

''بھابھی نے بھیجا ہے، ملتان میں ہماری پرانی ملازمہ کی نواسی ہے۔ یہاں کی نوکرانیاں تو حد درجہ خرانٹ ہو چکی ہیں۔ مستقل طور پر رہنے پہ تو تیار ہی نہیں ہوتیں۔ وہ کچن کی دونوں ملازمائیں اور وہ جو دو دوسری آتی ہیں صفائی وغیرہ کے لئے ...... آئے روز چھٹیاں ...... اس لئے بھابھی سے کہلوا کر اسے بلوالیا۔ اب میں تو چوبیس گھنٹے گھر پہ نہیں ہوتی ان چورنیوں کی رکھوالی کے لئے۔ جو بھی غیر حاضر ہو گی یہ اس کا کام نپٹا دے گی اور بھی گھر کے سو چھوٹے بڑے کام ہوتے ہیں۔ اماں جان جب سے گزری ہے، کوئی بھروسے کی ملازمہ ملی ہی نہیں گھر دیکھنے کے لئے۔ دو سالوں میں دماغ گھوم گیا ہے میرا۔ یہ بچپن سے ملتان والی حویلی میں رہتی آئی ہے۔ بھابھی بتا رہی تھیں بڑا اچھا انتظام سنبھالتی ہے۔''

''بھابھی سے کہنا تم کم از کم اسے نہلا دھلا کے تو بھیجتیں۔ کمرے میں عجیب سی بو پھیلا گئی ہے۔'' ناک چڑھا کے وہ ائیر فریشنر سپرے کرنے لگا۔

''تمہیں کوئی صاف ستھری، ذرا قبول صورت ملازمہ نہیں ملی کیا؟''

''قبول صورت ......تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے اخبار میں ضرورت رشتہ کے لئے اشتہاروں میں لکھا ہوتا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''اب یہ عجیب وغریب مخلوق چوبیس گھنٹے سر پہ سوار رہے گی۔'' ڈریسنگ روم سے کپڑوں کی گٹھڑی سی بن کر لے جاتی نچھو کو دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔ ڈھیلے ڈھالے تیز نارنجی اور ہرے رنگ کے ساٹن کے شلوار قمیص میں سے پسینے کے تیز بھبھکے اٹھ رہے تھے۔ ٹنگی ہوئی شلوار سے میلے ٹخنے اور پھٹی ہوئی ایڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بد رنگ بالوں میں اس قدر تیل انڈیلا ہوا تھا کہ بہہ کر چہرے پہ آتا ہوا سانولے رنگ کو مزید کالا سیاہ بنا رہا تھا۔

''اوکم آن وارث! آپ کونسا چوبیس گھنٹے گھر پہ موجود ہوتے ہیں۔''

''جس وقت بھی ہوتا ہوں، کم از کم اس وقت اس چیز کو میرے سامنے مت لایا کرو۔ سارا موڈ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔''

''او کے...... او کے...... میں اسے سمجھا دوں گی۔ اسی ہفتے آئی ہے، مجھے ٹائم نہیں ملا کہ اسے دو چار کپڑے لے دیتی۔ اپنے ہی پرانے نکال دیتی ہوں فی الحال۔ اور صاف ستھرا رہنے کی بھی سختی سے تاکید کر دوں گی۔''

اس نے یقین دہانی کرائی کیونکہ وہ وارث کی نفاست پسندی اور اعلیٰ جمالیاتی حس سے آگاہ تھی۔ اپنے اردگرد ذراسی بھی بے ترتیبی، گندگی اس سے برداشت نہ ہوتی تھی اور نچھو تو اس وقت سراپا بے ترتیبی لگ رہی تھی۔ یقیناً وارث کا پارہ تو چڑھنا ہی تھا۔

''چلیں اب موڈ ٹھیک کر بھی لیں نا۔''

آئینے کے سامنے کھڑے تنقیدی نظروں سے اپنے آپ کا جائزہ لیتے، ڈارک گرے سوٹ، گرے اور وائٹ لائننگ والی ٹائی، گولڈ کف لنکس، وائٹ شرٹ میں ملبوس وارث نواز علی کے شانے پر سر رکھتے ہوئے سجل نے کہا۔

اونچے لابنے وارث کو اپنے عکس کی پشت پہ اس کی شبیہہ لہراتی نظر آئی تو مسکرایا۔

''موڈ تو تمہیں دیکھتے ہی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ تمہاری پیاری پیاری سی اسمائل...... کسی کا موڈ خراب رہنے دے گی بھلا؟ یہ جھیل جیسی آنکھیں، یہ سیب جیسے گال، یہ گلاب کی پنکھڑی جیسے لب، یہ گھٹاؤں سی زلفیں...... یہ نازک سراپا...... اف...... تم تو......''

''بس بس...... یو آر آل ریڈی لیٹ۔'' سجل نے اس کے تعریفی بیان کے آگے پل باندھا۔ ایسے قصیدے وہ صبح شام سنتی تھی اور سرشار ہوتی رہتی۔ وہ پلٹ کر دراز سے وارث کا والٹ نکالنے لگی۔

ٹائٹ فٹنگ والی شرٹ سے کمر کا اضافی گوشت بوٹیوں کی صورت باہر کو ابل ابل کے ظاہر ہو رہا تھا۔ بمشکل شانوں تک آتے انتہائی ہلکے بال اس وقت گیلے ہونے کی وجہ سے گردن سے چپکے ہوئے تھے اور سر کی جلد تک جگہ جگہ سے نظر آ رہی تھی۔ وارث نواز علی نے اس کی پشت پر ناگوار سی...... ایک سخت نظر ڈالی۔

☆

شہر کے پوش ایریا میں بنی اس محل نما کوٹھی میں جس کا لان ہی کئی کنال پہ پھیلا ہوا تھا اس وقت رنگ و بو کا سیلاب اُمنڈ ہوا تھا۔ سوسائٹی کی کریم یہاں موجود تھی۔ بڑے سے بڑا بزنس مین، اونچے سے اونچا بیورو کریٹ، کئی نامی گرامی سیاست دان.... شوبز کے چند معروف چہرے بھی جگمگا رہے تھے۔ یہ پارٹی ایک گروپ

آف کمپنیز کی جانب سے دی گئی تھی۔ کہنے کو یہ ایک بزنس پارٹی تھی لیکن فی الحال تمام شرکاء بزنس کی بھول بھلیوں سے بے نیاز رقص وسرور کی محفل گرمانے میں مگن تھے۔

وارث نواز علی یہاں سفیان کیانی کے بلاوے پر آیا تھا۔ اس کا ذاتی طور پر اس گروپ آف کمپنیز کے ساتھ کوئی بزنس ریلیشن نہیں تھا...... وہ کاسمیٹکس، سوپ اینڈ ڈٹرجنٹ، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ پروڈیوس کرتے تھے۔ جبکہ وارث ان سے بالکل مختلف کنسٹرکشن کا بزنس کرتا تھا۔ لیکن چونکہ اپنے بزنس سرکل میں اس کا بھی خاصا نام تھا اس لئے شہر کے دیگر معززین کی طرح اسے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ سفیان کیانی، جس کی معروف اشتہاری کمپنی اس گروپ آف کمپنیز کا ایڈورٹائزنگ کا شعبہ سنبھالے ہوئے تھی، اسی کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا۔

یہ پارٹی کینیا کی کسی بزنس کمپنی کے اعزاز میں دی جا رہی تھی شاید اس گروپ کے چیئرمین کا ارادہ اب وہاں تک بزنس پھیلانے کا ہو یا وہ اس گروپ کی کوئی پراڈکٹ لانچ کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر وارث کا یہاں اتنے اہتمام کے ساتھ پہنچنے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ ان پارٹیز کے ذریعے دیگر کمپنیز کے ساتھ تعلقات مزید بڑھانا تو مقصود تھا ہی لیکن دوسری بڑی وجہ یہاں مس نشاء کی موجودگی تھی۔

مس نشاء پاکستانی نژاد تھی، یہ الگ بات کہ اسے شہرت ہمسایہ ملک کے ذریعے ملی۔ پاکستانی باپ اور آئرش ماں کی یہ بیٹی امریکہ میں پلی بڑھی۔ بچپن ہی سے ایکٹریس بننے کا شوق انڈین فلمیں دیکھ دیکھ کر پروان چڑھا۔ نیویارک میں ہونے والے کسی شو کے ذریعے اس کا رابطہ بولی ووڈ کے ایک ڈائریکٹر سے ہوا جس نے اسے انڈیا آنے کی دعوت دی۔ انڈیا سے ماڈلنگ کا آغاز ہی اسے شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ آئرش نقوش میں مشرقی حسن کی ملاوٹ اسے انفرادیت بخشتی تھی اور انڈیا کی بے باک ترین ماڈلز کو بھی اس کا امریکہ کی آزاد فضاؤں میں پروان چڑھا جسم مات دیتا تھا۔ ایک سال کے اندر اندر ہی وہ انڈیا کی ٹاپ ماڈل بن گئی اور اس کا کریز پاکستان تک جا پہنچا۔

انڈین ماڈل ہونے کے باوجود چونکہ وہ پاکستانی نژاد اور امریکن شہریت کی حامل تھی اس لئے اس کے پاکستان میں ماڈلنگ کرنے پہ پابندی نہ تھی۔ کئی لوگوں نے اسے سائن کرنا چاہا لیکن معاوضہ سن کر کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔ ڈیڑھ منٹ کے اشتہار کا جتنا معاوضہ وہ مانگتی تھی اس میں تین تین گھنٹے کی دو پاکستانی فلمیں بن سکتی تھیں۔ آخر کار اس گروپ آف کمپنیز نے بازی مار لی اور اسے ایک نہ دو اکٹھے تین اشتہاروں کے لئے سائن کر لیا۔ ابھی یہ اشتہار آن ایئر نہیں گئے تھے لیکن ان کی دھوم مچ چکی تھی اس بار اس گروپ نے اپنی مخصوص ایڈورٹائزنگ ایجنسی یعنی سفیان کیانی کے بجائے انڈیا ہی کی کسی کمپنی سے اشتہار تیار کروائے تھے۔ سنا گیا تھا کہ یہ بھی مس نشاء ہی کی شرط تھی۔

وارث بھی غیر ملکی چینلز پر نشاء کی بے باک ترین ماڈلنگ دیکھ دیکھ کر اس کا اسیر ہو چکا تھا۔ مشہور برانڈ

کی اس جینز کا اشتہار تو اس کا پسندیدہ تھا جس میں وہ گھوڑے پہ سوار ہواؤں سے لڑ رہی تھی۔ اس کے گھنے ریشمی ہلکے سنہری بال سلوموشن میں دلکش انداز میں لہرا رہے تھے اور اس کا وحشی حسن دل میں ہلچل سی مچا دیتا تھا۔ اسی وحشی حسن کو تسخیر کرنے کا ارادہ دل میں لئے آج وارث نواز علی اس پارٹی میں موجود تھا۔ محفل پورے جوبن پہ تھی لیکن تا حال مس نشاء کی آمد نہ ہوئی تھی۔

''ہیلو مسٹر وارث......!''

وہ کیانی کے ساتھ سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے واڈکا کا سیپ لے رہا تھا جب مسز نیلم صفدر شیخ اپنی نیٹ کی ساڑھی کا پلو کچھ سنبھالتی کچھ گراتی اس کے قریب چلی آئیں۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ ان کی گرم جوشی کا جواب دیا۔

''ڈیئر از سجل...... اونو...... اگین......؟'' اس کے آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے نیلم نے بڑے ناز سے شکوہ کیا۔

''یہ شکایت تو ہمیں بھی ہے۔ مسٹر وارث ہمیشہ اکیلے ہی آتے ہیں۔'' مسز لودھی نے مڑ کر گفتگو میں حصہ لیا۔

''لیڈیز...... لیڈیز......! آپ کی شکایتیں سر آنکھوں پہ...... لیکن سجل...... یونو...... وہ بزنس پارٹیز سے الرجک ہے۔ اب اگر میں فورس کر کے اسے لاؤں گا تو حقوق نسواں کی علمبردار آپ ہی خواتین ہیں تب بھی آپ کو شکایت ہوگی۔'' اس نے بمشکل انہیں ٹالا۔

''یار یہ سجل...... آئی مین بھابھی...... واقعی پارٹیز سے الرجک ہیں یا تم انہیں یہاں لانے سے الرجک ہو۔'' کیانی نے بے تکلفی سے سوال کیا۔

''جو بھی سمجھ لو۔'' وارث نے آخری گھونٹ لے کر پاس سے گزرتے ویٹر کے ہاتھ میں رکھی ٹرے پہ گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی اسے یہاں لانے کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں۔ الٹا اپنے ہی نمبر کم ہوں۔ اب تم سے کیا تکلف، تم تو جانتے ہی ہو ہماری سوسائٹی میں یہ سب کتنا کاؤنٹ ہوتا ہے، یونو...... پرسنالٹی میگنٹ پرسنالٹی چارم، اٹریکشن......اور وہ عورت دو تین سال میں ہی اپنا سارا چارم لوز کر چکی ہے۔''

''لیکن تمہاری تو لو میرج تھی۔'' کیانی نے کریدا۔

''ہونہہ، لو میرج...... ڈیم اٹ......'' ہلکا سا نشہ بھی انسان کو ہوش و حواس سے مکمل بے گانہ نہ بھی کرے تو کم از کم اس سطح پہ تو لے آتا ہے کہ وہ مصلحت کوشی اور بردباری جیسے ہتھیاروں کو پھینک دیتا ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا، وارث کی رگوں میں دوڑتے سرور نے اس کے اندر کی کوفت کو باہر نکال دیا۔ ''لٹو تو میں اس

کی شکل وصورت پہ ہی ہوا تھا۔ اس پہ اس کا گریز...... جھجک...... جسے میں اس کی ادا سمجھا۔ اسی انفرادیت نے مجھے اٹریکٹ کیا تھا۔ اتنے سال فارن میں رہ کے میں یہ مشرقی طور طریقے بھول ہی چکا تھا۔ واپس پاکستان آنے کے بعد اپنے سرکل میں بھی اس کا مظاہرہ کم ہی دیکھا ایسے میں سجل مجھے الگ سی لگی اور میں اسے اپنانے پہ تل بیٹھا۔ میرے پیرنٹس، فرینڈز سب نے مجھے سمجھایا، خاندان اور دولت کا ہم پلہ ہونا ہی کافی نہیں ہوتا، لائف سٹائل بھی میچ کرنا چاہیے لیکن میں نہیں سمجھا۔

ادھر اس کی فیملی بھی رضا مند نہیں تھی۔ ہزاروں شرطوں کے بعد مانے وہ لوگ اگر میں اپنے پیرنٹس کا اکلوتا نہ ہوتا اور سجل کے عشق میں انہیں جان سے گزرنے کی دھمکیاں نہ دی ہوتیں تو وہ کبھی یہ شرطیں نہ مانتے۔ اس جاٹ زمیندار نے میری پراپرٹی میں ففٹی پرسنٹ کا حصہ دار بنا کے اپنی بیٹی میرے حوالے کی...... ڈیم اٹ...... اندھا ہو گیا تھا میں...... وہ شرم، جھجک، گریز...... سب اس کے اندر کا پینڈو پن تھا۔

ملتانی جٹی آج شادی کے آٹھ سال بعد بھی، شہر کے سب سے مہنگے ڈیزائنر کے آوٹ فٹس پہننے اور کلاس کی بیوٹیشن سے تیار ہونے کے بعد بھی وہی کی وہی ہے۔ کینئرڈ کالج میں گزرے تین سال بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور سب سے بڑا ظلم جو میرے ساتھ ہوا وہ یہ کہ دو تین سالوں بعد ہی اس کے رنگ روپ نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ کمر سے کمرہ بن گیا، ریشمی چٹیا اب دو تین باریک لٹوں میں بدل چکی ہے، بادامی آنکھیں رخساروں کے ابھار کے اندر دفن ہو چکی ہیں، تم ہی بتاؤ...... میں کس برتے پہ اس فٹ بال کو ہر جگہ گھسیٹتا پھروں۔"

"کمال ہے یار......! بھابی کے سامنے...... بلکہ ہم سب کے سامنے بھی تم تو ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ ہم تو تمہیں پکا پکا جورو کا غلام سمجھتے ہیں۔"

"کرنی پڑتی ہیں تعریفیں...... کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے باپ نے ایسا تگڑا بندوبست کیا ہے کہ میں اس سے چھٹکارا تو پا نہیں سکتا اور اس کے ساتھ بنائے رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کی آنکھوں پہ پٹی باندھے رکھوں...... محبت کی، عشق کی، اعتماد کی...... اس پٹی کے باندھنے کے بعد اسے صرف سنائی دیتا ہے...... وہ قصیدہ جو میں اس کے گمشدہ حسن کی تعریف میں پڑھتا ہوں...... دکھائی کچھ نہیں دیتا اور یہی میں چاہتا ہوں اسے اس بات پہ اندھا یقین ہے کہ میں سر سے پیر تک اس کے عشق میں مبتلا ہوں۔ اس کے ایک ایک نقش پہ فدا ہوں، اس کے آگے میری نظروں میں کوئی حور پری بھی نہیں جچ سکتی۔ بس وہ اسی میں مست ہے، مگن ہے۔ کوئی آ کر اسے کہہ بھی دے کہ میں اس وقت فلاں فلاں کے ساتھ ہوں تو وہ کہنے والے کا منہ نوچ لے گی۔ اس حد تک مجھ پہ بھروسہ کرتی ہے۔"

"کمال ہے یار! مان گئے تمہاری استادی۔" کیانی نے زبردست قہقہہ لگایا۔

''اور میرا خیال ہے، تم اس لئے بھی انہیں یہاں ایسی گیدرنگز میں نہیں لاتے ہوتا کہ اصل اور سچا حسن دیکھ کر کہیں وہ اپنی خوش فہمی سے باہر نہ آجائیں۔''

''بالکل......'' اس نے تائید کرتے ہوئے سامنے نظر اٹھائی اور جیسے ساکت رہ گیا۔ سہج سہج قدم اٹھاتی، بے شمار معززین کے جلو میں وہ یقیناً مس نشاء تھی۔ کیانی بھی اس کی طرح بے اختیار ہو گیا۔ اسکرین پر اس کی حشر سامانیاں کم نہ ہوتی تھیں اور اس وقت تو وہ روبرو تھی۔ ریزرو رہنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بیورو کریٹس بھی اس کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ اس کے آنے سے پہلے محفل میں رنگینیاں بکھیرتی لیڈیز اب کونے میں سرکتے ہوئے رشک و حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

وارث نے نظر بھر کے اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ دل خود بخود ہی اس کا موازنہ اس بھدی سی سجل سے کر بیٹھا جو اپنے جاٹ باپ کی سیاست کی وجہ سے آج اس کے سر پہ چڑھی بیٹھی تھی ورنہ اس کے چند روزہ حسن کے رنگ اتنے کچے تھے کہ وہ کب کا اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا اگر جو وہ ففٹی پرسنٹ کی......

پانچ فٹ آٹھ انچ کے قد کے ساتھ موزوں ترین فگر لئے وہ وارث نواز علی کو اپنے ساتھ میچ کرتی نظر آئی۔ شانوں سے بھی نیچے تک آتی ستر کلو کی سجل کو اس نے خیالوں ہی خیالوں میں ایک لات رسید کی۔ اس کی سونے جیسی چمکتی رنگ کے آگے سجل کی سفید رنگت میں پیلاہٹ گھلتی نظر آئی۔ اس کے سونے کے تاروں کے ڈھیر کی صورت بکھرے گھنگریالے بالوں کے سامنے سجل کی مری چوہیا جیسی زلفیں پس منظر میں چلی گئیں۔

وہ قریب آتی گئی......قریب اور قریب۔ یہاں تک کہ وارث اس کی سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ڈائمنڈ لاکٹ کا اتار چڑھاؤ بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے کچھ فاصلے پہ کھڑے شیروف بھائی سے مل رہی تھی۔

بلیک ویلوٹ کا آف شولڈر گاؤن جس کے گریبان کی ''وی'' بہت اندر تک گئی تھی۔ جس سے چپکا تمام نشیب و فراز افشا کر رہا تھا۔ لانبے لانبے سڈول بازو، کسی بھی آرائشی زیور سے بے نیاز تھے۔ بیش قیمت ڈائمنڈ جیولری گردن، کانوں اور انگلیوں میں سج کر اپنی قدر بڑھا رہی تھی۔ فرنچ کلون کی مہک نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بے پناہ چمکتی ہوئی جلد کی تابنا کی عروج پہ تھی۔ قاتل کٹاؤ والے لبوں پہ جاندار سی چمکیلی مسکراہٹ پرغرور انداز میں اترا رہی تھی۔ نیلگوں گہرائی والی ابھری ابھری آنکھیں اس کے مشرقی نقوش میں مغربی آمیزش کر رہی تھیں۔ اس کی ہر ادا میں ایک بانکپن تھا، ہر قدم ہی ایک فتنہ تھا۔

''مس نشاء! یہ یہاں کی سب سے بڑی کنسٹرکشن کمپنی کے اونر ہیں'' کسی نے اس کا تعارف کرایا۔ نشاء کا مرمریں ہاتھ ذرا سا بلند ہوا اور اس کے آگے بڑھے پرجوش ہاتھ کو ہلکا سا چھو کر نیچے آ گیا۔ لبوں پہ وہی مخصوص مسکراہٹ تھی...... جو شاید سب کے لئے تھی۔ وارث کا دل ذرا سا برا ہوا لیکن وہ ابھی خود کو حوصلہ دیتے ہوئے مزید پیش قدمی کا ارادہ کرتے ہوئے لب کھولنے ہی والا تھا کہ وہ اسی طرح قیامت کی چال چلتی آگے

بڑھ گئی۔ وہ تلملا کے رہ گیا۔ اسے اپنی وجاہت پہ خاصا غرور تھا جبکہ نشاء مسلسل اس موٹے، گنجے اور چیچک زدہ مسٹر نائیکے کے ساتھ چپکی ہوئی تھی جو کینیا سے درآمد شدہ تھا، باقی کی عنایات کریم فاروقی کے لئے مختص تھیں جو کیئر گروپ آف کمپنیز کا چیئرمین تھا۔

''ایک کروڑ لئے ہیں اس نے ان تین اشتہاروں کے۔'' کیانی نے اطلاع دی۔

''واٹ......؟'' وہ اچھلا۔

''ہاں اور یہ تو صرف اس کا معاوضہ ہے۔ غیر ملکی کمپنی سے اشتہار بنوانے میں جو سرمایہ صرف ہوا وہ الگ۔ سوئٹزرلینڈ، ماریشس اور پیرس میں شوٹنگ ہوئی ہے۔ میوزک، انڈیا کے ٹاپ میوزک ڈائریکٹر کا ہے۔ جنگلز آشا بھونسلے کی آواز میں ہیں۔''

''پھر تو یہ کروڑوں کا پروجیکٹ ہوا۔'' اس کی عقل نے نشاء کا کریم فاروقی کے آگے پیچھے پھرنا تو بمشکل ہضم کیا لیکن دل بدستور ہمک رہا تھا۔ دل ہی کے اکسانے پہ ہمت کر کے وہ ڈانسنگ فلور پہ چلا گیا۔ اس نے بڑے ہی اسٹائل کے ساتھ سگریٹ کے کش لگاتی مسز کریم فاروقی کو ڈانس کی پیشکش کی۔ پچاس کے پیٹے میں، بنگالی نسل کی سانولی سلونی مسز نازلی کریم، ڈیشنگ سے دراز قد، ویل ڈریسڈ اور ویل مینرز وارث نواز علی کی آفر رد نہ کر سکیں اور اپنی بنگالی انداز میں باندھی میرون ساڑھی کو سنبھالتے ہوئے اس کے ساتھ فلور پہ چلی آئیں۔ ایک دو راؤنڈز کے بعد ہی وہ نامحسوس طریقے سے کریم فاروقی کے پاس چلا آیا جو اس وقت اردگرد کے ماحول سے یکسر بے نیاز نشاء کے ساتھ رقص میں مصروف تھا۔ سوچی سمجھی سکیم کے تحت وارث دانستہ اس سے ٹکرایا اور پھر چونکنے کی بھرپور ایکٹنگ کرتے ہوئے مسز نازلی کا ہاتھ تھام کر کریم فاروقی کے آگے پیش کیا۔ ڈانس کے ایٹی کیٹس کے مطابق اب کریم فاروقی کو نہ چاہتے ہوئے بھی پارٹنر تبدیل کرنا تھا۔ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ وارث نشاء کو بانہوں میں سنبھالتے میوزک کے ردھم کے ساتھ ہولے ہولے تھرکنے لگا۔ ہلکے سُروں میں ایک سوفٹ سا رومانٹک انگلش میوزک پس منظر میں گونج رہا تھا۔ وارث نے اپنی مشہور زمانہ لیڈی کلر اسٹائل میں مزید جان ڈالتے ہوئے نشاء کی طرف جھک کر کہا۔

''میں نے اتنا بے داغ اور مکمل حسن آج تک نہیں دیکھا۔''

''تھینک یو۔'' ہلکے سے تبسم کے ساتھ اس نے یہ خراج تحسین قبول کیا۔

''یہ کہنے کا موقع تو آپ مجھے دیجیے۔ میں آپ کے اعزاز میں ایک پارٹی کرنا چاہ رہا ہوں۔ اگر آپ وقت دیں تو ہم آج ہی طے کر لیں۔''

''ویل......مسٹر......'' وہ مستر دسی ہوئی۔

''وارث......وارث نواز علی۔'' اس کے اس طرح اپنا نام بھلا دینے پہ وہ خفت سے دوچار ہو گیا۔

''او...... یس...... وارث علی...... ان فیکٹ مسٹر وارث! میں انڈیا سے بس آج کے فنکشن کے لئے اسپیشلی آئی ہوں۔ وہ بھی کریم فاروقی کے بہت فورس کرنے پر۔ کل میری فلائٹ ہے۔'' اس کے صاف جواب پہ بھی وارث نے ہمت نہ ہاری۔

''مس نشاء! ہم بھی کریم فاروقی سے کم قدر دان نہیں۔ آپ کے اسٹینڈرڈ کے مطابق پورا پروٹوکول دیں گے آپ کو۔''

''ویل بٹ...... آئی مین کس سلسلے میں...... کریم فاروقی سے میرے بزنس ریلشنز ہیں جبکہ آپ......''

''میں بھی آپ سے ڈیل ہی کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''تو اس کے لئے آپ میرے سیکرٹری سے بات کیجیے۔ یہ ڈیل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔''

ڈانس کے دوران وہ دونوں اتنے قریب تھے کہ ہلکی سرگوشیوں میں کی گئی یہ گفتگو بھی بخوبی سن سکتے تھے اور اس قدر حدت آمیز قرب نے واث کو کچھ اور بھڑکا دیا اور بے تابی کا مظاہرہ کرتا ہوا کہنے لگا۔

''آپ سے اجازت درکار تھی، باقی معاملات سیکرٹری سے ہی نمٹائیں گے۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ میرے لئے وقت کب نکالیں گی۔''

''ایکچوئیلی میرے پاس فلمز کی ایک دو آفرز ہیں۔ مجھے پہلے تو واپس جا کر ان سے فائنل کرنا ہے پھر ہی آپ کو انفارم کرسوں گی۔ شوٹنگ شیڈول فائنل ہو جائے تو پتا چلے گا کہ ماڈلنگ کے لئے ٹائم نکلتا بھی ہے یا نہیں۔''

اس نے اب کے صاف جواب دینے کے بجائے گول مول لارا دیا۔ وہ جانتی تھی ہر کوئی اس جیسی مہنگی ماڈل افورڈ نہیں کرسکتا اکثر لوگ صرف اس سے ایک اور ملاقات کا بہانا ڈھونڈنے کی غرض سے آفر کرتے ہیں۔

''اوکم آن نشاء! ڈونٹ بی سو فارمل...... میں ماڈلنگ کے لئے سائن نہیں کر رہا آپ کو۔ آپ کا تھوڑا سا وقت چاہئے اور بس...... فلائٹ تو آپ کی کل کی ہے اگر آپ......'' نشاء نے ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو اس سے الگ کیا۔

''ریلیکس...... ریلیکس مس نشاء!''

''تڑاخ......'' ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر لگا اور اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا، ساری محفل کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ نشاء اونچی اونچی آواز میں ''بلڈی ایشین'' کو گالیاں بکتی فلور سے نیچے اتر گئی۔ کریم فاروقی اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ کچھ سننے پہ تیار نہ تھی۔

''میں ہی اسٹوپڈ تھی۔ وہاں سب نے مجھے سمجھایا کہ یہاں شوبز کی عورتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا، ہر کوئی اپنی اوقات کے مطابق قیمت لگاتا ہے لیکن میں نہ مانی۔ اب پتا چلا کہ یہ سب سچ تھا۔ یہ شخص...... یہ شخص میری قیمت لگا رہا ہے۔ مجھے...... نشاء کو۔'' وہ بپھری ہوئی تھی۔

پارٹی میں موجود تقریباً تمام معززین نے اسے سمجھا بجھا کر راضی کرنے کے ساتھ ساتھ وارث کو بھی لعنت ملامت کی۔ وہ اتنی انسلٹ سہہ نہ سکا اور پارٹی سے نکل آیا۔

ڈرائیونگ کے دوران بھی وہ مسلسل سلگتا رہا۔

''یہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ پارسا، نیک بی بی...... سکرین پہ کس کس قسم کا اشتہار نہیں کیا اس نے۔ کیسے بھڑک رہی تھی...... ارے کیمرے کے سامنے...... بات صرف اتنی ہے کہ کریم فاروقی کے لگائے کروڑوں کا خمار سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ کینیا کے مسز نائیکے نے بھی کوئی خوش کن لارا دیا ہوگا۔ دو فلموں میں سائن ہو کے اور بھی سرخاب کے پر لگ گئے۔ لیکن...... لیکن منع ہی کرنا تھا تو ویسے ہی کر دیتی...... کمینی نے اتنے لوگوں میں تماشا بنا ڈالا۔ تھپڑ دے مارا...... میرے منہ پر...... وارث نواز علی کے منہ پر۔ سوسائٹی میں میری کوئی عزت ہے، مقام ہے۔ یہ پانچ کروڑ لے تب بھی رہے گی تو جسم بیچنے والی...... سکرین پہ ادائیں دکھا کے بیچے۔ ہونہہ...... شوبزنس...... کہاں کا پروفیشن...... نرا بزنس ہی بزنس۔'' اپنی تذلیل یاد کر کے وہ نئے سرے سے بھڑک اٹھا۔ غلیظ سے غلیظ گالی سے اسے نوازنے کے بعد بھی سینہ ٹھنڈا نہ ہو رہا تھا۔

''بانس کا بانس، پتا نہیں کیوں لوگوں نے سر چڑھا رکھا ہے بیوٹی کوئن کہہ کہہ کے۔ ڈھانچہ ہے بالکل۔''

☆

سخت طیش کے عالم میں وہ گھر پہنچا۔ پورچ میں اپنی مرسڈیز لگاتے ہوئے اس نے سجل کی کرولا وہاں کھڑی نہ دیکھی تو ٹھٹک گیا۔ کچھ یاد سا تو آ رہا تھا کہ اس نے کہیں جانے کا ذکر کیا ہے...... مگر کہاں...... یہ ذہن سے نکل گیا۔ وہ سر جھٹکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ لاؤنج میں رکھاٹی وی فل الیوم میں آن تھا۔ کسی پنجابی فلم کا ہوش ربا رقص جاری تھا اور کارپٹ پہ بیٹھی نچھو آم چوسنے میں مگن تھی۔

''واٹ ربش! یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کے دھمال نما گیت کی بلند آواز کا گلا گھونٹا۔ نچھو تڑپ کے اٹھی تھی۔ اس کا لمبا دوپٹہ اسی کے پیر تلے آیا اور وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ کھسیانے سے انداز میں ایک ہاتھ سے صوفے کا سہارا لیتی اور دوسرے ہاتھ سے منہ پہ لگا آم کا گودا صاف کرتی وہ کھڑی ہوگئی۔

''کہاں ہے سجل!'' وہ ناگواری سے اس کے سنے ہوئے ہاتھ دیکھنے لگا۔

''جی بیگم صاحب تو اپنے بھائی کے گھر گئی ہیں۔''

''اوہ......'' اسے یاد آ گیا، اس کے بڑے سالے خاور جو لاہور میں ہی رہتے تھے، کی بڑی بیٹی کی شادی طے پا گئی تھی۔ ابھی صبح ہی سجل نے بتایا تھا کہ آج سے ڈھولک کی رسم شروع ہو رہی ہے۔

''اور بچے؟''

''جی وہ بھی ساتھ ہیں۔''

''کیا؟ مگر وہاں تو رت جگا ہوگا۔ ساری ساری رات ہی ڈھولک بجاتے رہتے ہیں یہ لوگ۔ بچوں کو یوں ساتھ لے گئی سجل۔ کیا صبح انہوں نے سکول نہیں جانا۔'' اسے اپنے بچوں کا ننھیال سے زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں تھا۔

''او جی، پتا نئیں......'' وہ تابڑ توڑ سوالات سے سہم گئی۔

''ہاں جی یاد آیا وہ سویرے تو ہفتہ ہے۔ بچوں کو ہفتہ اور اتوار چھٹی ہوتی ہے۔''

''اچھا یہ تھیٹر بند کرو...... اور کھانے پینے کے شوق اپنے کمرے میں پورا کیا کرو۔ میں کمرے میں ہوں مجھے ایک کپ کافی بھجوا دینا...... بنانی آتی ہے؟'' جاتے جاتے وہ مڑ کے پوچھنے لگا۔

''آہو جی......'' وہ جلدی جلدی سے سر ہلانے لگی۔ وارث اپنے کمرے کی طرف مڑا تو وہ سوچنے لگ گئی۔

''بھجوا دینا...... عجیب صاب ہے۔ گھر میں مجھے اکیلا پا کے بھی کسی کے ہاتھ کافی بھجوانے کا کہہ رہا ہے۔ وڈی بھابھی بھی کہتی تھی چھوٹی بیگم صاحبہ مرد ضرورت سے زیادہ شریف ہے۔ چلو اچھا ہے...... ذرا سکون سے دن گزریں گے...... پر کس کے ہاتھ کافی بھیجوں۔ ننھا اور موجو تو چھٹی لے کے چلے گئے۔ باہر بس چوکیدار ہے اسے اتنے سے کام کے لئے کیا بلانا۔ خود ہی لے جاتی ہوں۔ ذرا دیکھوں تو صاب جی کے کتنے نخرے ہیں۔''

کچی عمر میں ہی حویلیوں کے مردوں کی ''چاکری'' کر کر کے اس کی ساری معصومیت ہوا ہو چکی تھی۔ صبح صاب کی زبانی اپنے بارے میں نفرت بھرا بیان سن کر اسے تاؤ بھی خوب آیا تھا۔ اب کافی بنانے سے پہلے اس نے خوب رگڑ کے جھاگ والے خوشبودار صابن سے منہ دھویا۔ بیگم صاحبہ اپنا پرانا سوتی جوڑا دے گئی تھیں جو اس کے لئے تو نیا ہی تھا۔ سر سے تیل بھی نکال لیا تھا دوپہر کو، خوب چھاچھ مل مل کے دھویا تھا۔ کافی پھینٹ کر اچھے سے مگ میں ڈالنے کے بعد وہ دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہو گئی۔

وارث بیڈ پہ آڑا ترچھا پڑا تھا۔ کوٹ تکیے پہ ڈھیر تھا۔ شوز کے تسمے کھلے تھے مگر پاؤں سے اتارنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ یہی حال ٹائی اور شرٹ کا تھا۔ ٹائی کی ناٹ بھی کھلی تھی اور شرٹ کے سارے بٹن بھی، وہ ٹکٹکی باندھے چھت کو گھور رہا تھا۔ ذہن کی سکرین پہ وہ فلم نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار ریوائنڈ ہو کے چل رہی تھی جس میں......

''بچ!'' لہجے میں زمانے کا زہر بھر کے اس نے گالی بکی۔

''صاب......! کافی......!''

وارث نے لال انگارہ نظروں سے اسے دیکھا۔ واضح تبدیلی کی جھلک نے اس کی ذہنی رو کا رخ دوسری جانب کر دیا۔ کچھ گھنٹے قبل وہ جتنی غلیظ لگ رہی تھی اب اتنی نہیں تھی۔ نیلے رنگ کا کاٹن کا سوٹ شاید سجل

کی اترن تھا۔ اسے یاد آیا یہ سوٹ ایک دو بار ہی اس نے پہنا تھا کہ تنگ ہو گیا تھا، پہلے ہی فٹنگ والا سلوایا تھا لیکن دوسری بار پہننے کی کوشش میں وہ ہلکان ہو گئی تھی۔ تھل تھل کرتے بازو اسٹائلش سلی ہوئی ہاف سلیوز میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ یہی تنگ قمیص اس وقت نچھو کے بدن پہ ڈول رہی تھی۔ سڈول چکنے سانولے بازو مشقت کی بھٹی میں دلکش ساخت اختیار کر چکے تھے۔ سانولے رنگ پہ تیل کی چکنائی مفقود تھی، اب کسی سستے سے ٹالکم پاؤڈر کی سفیدی جا بجا تھپی ہوئی تھی، شاید گیلے چہرے پہ بھی پاؤڈر لگا لیا تھا، ناک کے پاس، ٹھوڑی پہ، گردن پہ اچھا خاصا جما ہوا تھا۔ پھٹی ہوئی، ادھڑی کھال والے بدوضع ہونٹوں کو تیز رنگ سرخی سے ڈھانپا گیا تھا۔ وارث چونکا۔ کچھ منٹ پہلے یہ سنگھار نہیں تھا تو پھر اب...... اس کے اندر جیسے کوئی سگنل بجا۔

''تم کیوں لائیں کافی موجو کہاں ہے؟''

''جی! اسے تو بیگم صاحبہ نے جلدی چھٹی دے دی تھی اور ننھے کو بھی کوارٹر بھیج دیا تھا۔''

''کیوں؟''

''وہ جی...... دراصل...... گھر کوئی نئیں تھا ناں جی...... میرا مطبل ہے کہ میں اکیلی تھی اس لئے بیگم صاحبہ نے انہیں......'' دوپٹہ کا پلو انگلی پہ لپیٹتے، کھولتے اس نے واضح کیا۔

''اوہ...... تمہاری بیگم صاحبہ نے تمہیں میرے متعلق کوئی ہدایت نہیں دی۔ میرا مطلب ہے کہ میرے سامنے آنے سے منع نہیں کیا۔'' اس نے کھوج لینا چاہا۔

''ہائے ہاں ناں جی...... آپ کوئی ایسے ہو؟ وہ موجو دا اور ننھا تو بدمعاش ہیں جی بدمعاش۔ اور پھر آپ...... آپ کو تو میں ویسے بھی بری لگتی ہوں، گندی...... میلی کچیلی...... کو جی۔'' (بدصورت) اس نے، کپکپاتے لہجے میں گلہ کرتے ہوئے کپ آگے بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔

''تم سے کس نے کہا کہ تم بدصورت ہو؟'' وارث کو اسے قریب سے دیکھنا اچھا لگا۔ جو بھی تھا سولہ سال کی جوانی کا نشہ ہی اور ہوتا ہے چاہے کسی رنگ میں بھی ہو، کسی ملبوس میں بھی ہو، کچھ وہ ویسے ہی نشے میں تھا کچھ نچھو کی دانستہ قربت اور مدہوش کر گئی۔

''آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے بیگم صاحبہ سے۔''

اس نے ترچھی نظر سے دیکھا اور وارث کو احساس ہوا کہ اس معمولی سے وجود پہ بھی یہ دو کالی سیاہ آنکھیں اچھی خاصی مسحور کن تھیں۔ وہ کپ رکھنے کے باوجود وہیں کھڑی تھی۔ وارث نے مالکانہ استحقاق کے ساتھ اس کا کھردرا، سانولا ہاتھ تھاما اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ بغیر کسی چوں چرا کے بیڈ کے سرہانے ٹک گئی۔

''تمہاری بیگم صاحبہ کا ایک مسئلہ ہے، انہیں میرے منہ سے ہر لڑکی کے بارے میں ایسی باتیں سن کر خوشی ہوتی ہے ان کا دل رکھنے کے لئے کبھی کبھی مجھے اپنا دل بھی مارنا پڑتا ہے، جیسے اس وقت صرف سجل کو خوش

کرنے کے لئے اور مطمئن رکھنے کے لئے مجھے تم سے بیزاری کا اظہار کرنا پڑا۔ حالانکہ میرا دل کب چاہ رہا تھا تم جیسی نازک سی، چھوٹی سی لڑکی کا دل توڑوں لیکن یہ بھی تو دیکھو اگر میں ایسا نہ کرتا تو تمہارا یہاں نوکری کرنا محال ہوتا جب تک تمہاری بیگم صاحبہ میری طرف سے مطمئن اور تمہاری طرف سے بے فکر ہیں تم یہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔'' وہ اس کی کانچ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا۔ نچھو کی مکمل سپردگی اسے کچھ دیر قبل ہونے والے تلخ حادثے کی سنگینی فراموش کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

''صاحب جی کہتے تو آپ بھی صئی ہو۔ بیگم صاحبہ آپ سے بات کرنے کے بعد واقعی خوش تھیں۔ مجھے یہ پرانا جوڑا دیا، نہانے کے لئے کہا...... مہربانی ان کی، ہم تو جی ان کی اترن میں خوش ہیں۔''

اس نے پتا پھینکا جسے وارث نے کمال ہوشیاری سے کیچ کر لیا۔ اور والٹ سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اسے تھمائے۔

''یہ لو اپنے لئے ذرا ڈھنگ کے کپڑے لے آنا...... تمہاری بیگم صاحبہ کی قمیص میں تو تمہارے جیسی دو آجائیں۔ کہاں وہ بارہ من کی دھوبن، کہاں تمہارا کچنار کی کلی سا نازک بدن......'' اس نے تیل کی کڑوی اور دہی کی کھٹی باس سے بھرے اس کے بدرنگ بالوں میں اپنا نشے سے ڈولتا سر گھساتے ہوئے کہا۔

......❁......

ایک مرد تین خط

قابل احترم والد بزرگوار

ابا جان! السلام وعلیکم!

میں پرسوں رات کو خیرت سے یہاں پہنچ گیا تھا اور خدا تعالیٰ سے آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔

میں جانتا ہوں آپ میرے خط کے شدت سے منتظر ہوں گے، اس لیے پہلی فرصت میں ہی آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ کوشش تو یہ ہی تھی کہ یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے آپ کو تفصیلی خط لکھوں مگر صرف خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دینے کا مختصر سا فون ہی کر سکا۔ آپ کی سخت ہدایت کا دھیان تھا کہ بلاضرورت لانگ ڈسٹنس کال مت کرنا۔ آپ کی دیگر نصیحتوں کی طرح میں نے یہ بھی گرہ سے باندھ لی ہے۔ آپ نے تاکید کی تھی کہ اس ایک عشرے کے قیام کے لیے میں نسبتاً سستے ہوٹل کا انتخاب کروں تاکہ زیادہ خرچہ نہ ہو۔ میں نے آپ کی ہدایت کے عین مطابق اس ہوٹل میں کمرہ لیا ہے جس کا روزانہ کا کرایہ فقط تیس چالیس روپے ہے۔ ویسے یہ ہوٹل ہے صاف ستھرا اور پرسکون...... پھر کسی مہنگے ہوٹل میں پانچ چھ سو روپے روزانہ کے حساب سے کمرہ لینے کا کیا تک...... آپ بالکل درست کہتے ہیں پیسہ کمانا مشکل ہے، اجاڑنا آسان۔ اوپر جانے میں وقت لگتا ہے، پھسل کر نیچے آنے میں محض ایک پل، ایسے ہی تو آپ اس مرتبے تک نہیں پہنچے۔ پیسہ کمایا ہی نہیں بلکہ سنبھالا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں بنا بنایا اور جما جمایا کاروبار مل گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم فضول کے عیش و آرام کی خاطر محنت سے حاصل کیئے اس سرمائے کو ضائع کر دیں۔ آپ کا یہ سنہری اصول میں نے دل پہ نقش کر رکھا ہے کہ دولت صرف کمانے کے لیے ہوتی ہے، اڑانے کے لیے نہیں، پیسہ صرف جمع کرنے کے لیے ہوتا ہے خرچ کرنے کے لیے نہیں اور حیثیت صرف بڑھانے کے لیے ہوتی ہے، گرانے کے لیے نہیں۔

اس ہوٹل میں مجھے کوئی تکلیف نہیں، کیا ہوا اگر اس میں اے سی نہیں، کیبل نہیں، یوں بھی میں ان سب کا شوقین کہاں ہوں، وقت بھی تو نہیں اللے تللوں میں پڑنے کا، جس کام سے ادھر آیا ہوں، ساری توجہ وہیں لگا رکھی ہے۔ رات ہی گزارنی ہے، کہیں بھی گزر سکتی ہے۔ میں تو ٹیکسی تک نہیں لیتا، یہاں بڑی بڑی

آرام دہ بسیں، ویگنیں ہیں، آرام سے آفس پہنچ جاتا ہوں، رات کو تھک ہار کے آنے کے بعد ایسی اچھی نیند آتی ہے کہ پنکھے کی ہوا بھی اے سی جیسی لگتی ہے۔

جیسا آپ نے کہا تھا میں نے کمپنی سے ویسی ہی ڈیل کی ہے۔ ابا جان، ویسے تو یہ کمپنی بہت اونچا نام رکھتی ہے۔ مگر آپ کا بیٹا بھی خدا کے فضل، ماں کی دعاؤں اور آپ کے سکھائے اصولوں کی وجہ سے کسی سے کم نہیں۔ پہلی میٹنگ میں وہ مجھ سے خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ امید ہے انشاءاللہ اگلی میٹنگ کے نتائج مزید حوصلہ افزاء ہوں گے اور یہ کانٹریکٹ ہمیں ہی ملے گا۔ دراصل کسی چھوٹے قصبے کی محدود ساکھ والی کمپنی کو کانٹریکٹ دینے کا یہ ان کا پہلا تجربہ ہے، اس لیے شاید زیادہ وقت لے رہے ہیں فیصلہ کرنے میں۔ ورنہ آپ کے بیٹے نے کوئی کوتاہی نہیں کی کچھ فارمیلیٹیز رہتی ہیں مکمل ہو جائیں تو شاید دس دن سے پہلے ہی کامیابی کے ساتھ واپس لوٹ آؤں گا۔

اور کیا لکھوں، یہاں کا موسم ہمارے قصبے کی نسبت ذرا زیادہ ہی گرم ہے مگر مجھے زیادہ تکلیف نہیں۔ موسم کی شدت سے میں اتنی جلد گھبرانے والا نہیں۔ اور ہاں ابا جان یاد آیا، ساتھ والے کمرے میں ایک دینی جماعت ٹھہری ہے۔ ان کے ساتھ فارغ وقت بہت اچھا گزرتا ہے۔ خوب تبلیغی و اصلاحی گفتگو سننے کو ملتی ہے۔ دل و دماغ منور سے ہو جاتے ہیں۔ میری اگلی میٹنگ دو دن کے وقفے کے بعد ہے، اس لیے آج کا پورا دن میں نے ان کے ساتھ جامع مسجد میں درس سنتے ہوئے گزارا اور کل کا سارا دن میں ان کے ساتھ تبلیغی دورے پر جا کر گزارنے والا ہوں۔ پنج وقتہ نمازی تو میں آپ کی تربیت کی وجہ سے ہوں ہی۔ اب آپ درس و تبلیغ کے بعد میرا بالکل بدلا ہوا روپ دیکھیں گے۔

اماں جان کی خدمت میں میرا مؤدبانہ سلام اور محبت پیش کیجیے گا۔ ہمشیرہ کو بھی سلام پہنچے...... ابا جان، ہمشیرہ کے لیے میں نے ایک بہت خوبصورت اور مناسب قیمت کا ڈنر سیٹ دیکھا ہے، آپ کی اجازت ہو تو ان کے جہیز کے لیے لے آؤں؟ اماں جان کے جوڑوں کے درد کے لیے یہاں کے ایک بہت قابل عالم نے پانی پڑھ کے دیا ہے، وہ بھی لیتا آؤں گا اور وہ کاروبار کی ترقی کے لیے بہت جادو اثر تعویذ اور نقش بھی عنایت کرتے ہیں ہدیہ فقط ڈیڑھ ہزار، آپ کہیں تو لیتا آؤں۔

عشاء کی اذان ہو رہی ہے۔ اب اجازت دیجیے۔ نماز ادا کر کے سو جاؤں تاکہ فجر کے لیے وقت پہ آنکھ کھلے۔

آپ کا تابعدار بیٹا
محمد رفاقت نعیم

میری پیاری شبانہ!
السلام وعلیکم،
کیسی ہو میری جان......؟ میری دلاری چہیتی بیگم......
کیا اب تک ناراض ہو، سمجھا کرو نا جان کیسے ساتھ لے جاتا تمہیں۔ میں لاہور گھومنے کی نیت سے نہیں

کاروبار کی غرض سے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہیں لاہور دیکھنے کا کتنا شوق ہے......بس دعا کرو جس مقصد سے آیا ہوں وہ پورا ہو جائے پھر تو لاہور آنا جانا رہا کرے گا۔ اس وقت کیسے تمہاری خواہش مان لیتا۔ تم تو ابا جان کے مزاج سے واقف ہو......ورنہ تمہاری خواہش رد کرنا میرے لیے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔

''تمہارا اداس چہرہ، روئی روئی آنکھیں، روٹھا روٹھا انداز مجھے نہ صرف سارے سفر کے دوران ستاتا رہا بلکہ اب کام کے دوران بھی میں تمہاری وجہ سے ہی بے چین ہوں۔ بس میرا یہ خط ملتے ہی اپنی ناراضی ختم کر ڈالو۔ میں واپس آؤں تو مجھے اپنی ہنستی مسکراتی شبانہ نظر آئے ٹھیک ہے؟

اور پھر میں یہاں تمہارے بغیر کونسا سکھی رہا ہوں؟ ابا جان نے اتنے پیسے نہیں دیے کہ کسی معقول جگہ ٹھہر جاتا، ستا سا پھٹیچر سا ہوٹل ہے، بدمزہ کھانے ہیں، فضول سی چائے اور بکواس ماحول تم اس قدر یاد آتی ہو۔ تم سے دور جا کر احساس ہوا کہ تم میرے لئے کسی نعمت سے کم نہیں۔ تمہارے ہاتھ کے بنے لذت دار پکوان، نرم گرم روٹیاں، خوشبودار چائے، نفاست سے استری شدہ کپڑے......نہ تمہاری محبتوں کا کوئی بدل ہے نہ خدمتوں کا۔

سنا ہے لاہور زندہ دلان کا شہر ہے مگر پھر میرا دل کیوں بجھا ہوا ہے؟ مجھے کوئی رونق کیوں نہیں بھا رہی؟ مجھے کوئی رنگینی کیوں نظر نہیں آتی؟ اس لیے شبانہ کہ میرا دل تمہیں دیکھ کر کھلتا ہے، تم میرے گھر کی رونق اور میری زندگی کی رنگینی ہو۔ اب تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ میں تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں، پتا نہیں کیوں......کبھی کبھی تم لوگوں کے بہکاوے میں آ کر مجھ سے جھگڑنا شروع کر دیتی ہو اور تیرا میرا، میرا تیرا کا مسئلہ کھڑا کر لیتی ہو۔ حالانکہ میرا سب کچھ تمہارا ہے بشمول میرے...... اسی طرح تم میری ہو، اپنے سب کچھ کے ساتھ۔ تمہارے بھائی، تمہارے حصے کی زمینوں کی آمدنی تمہیں دے گئے یا نہیں؟ اگر نہیں تو فون کر کے منگا لو......کسی پہ اعتبار مت کیا کرو چاہے سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ دراصل مجھے لگ رہا ہے ابا جان کے دیئے ہوئے پیسے سارے کے سارے لگ جائیں گے اور وہ تو آنے آنے کا حساب لیتے ہیں۔ اب بحث سے بچنے کا حل یہ ہے کہ تم سے لے کر انہیں واپس لوٹا دوں گا کہ آدھے سے زیادہ بچا کے لایا ہوں، وہ خوش ہو جائیں گے۔ سمجھا کرو انہیں خوش رکھنے میں ہمارا ہی بھلا ہے۔

میں بھی کیا کرتا، بڑے شہر ایسے ہی بڑے نہیں ہوتے، یہاں سب کچھ بڑا ہوتا ہے، خرچے بڑے قیمتیں بڑی، گرمی اس قدر ہے کہ دو ایک بار دھوپ میں چکراتے چکراتے گر پڑا، ویگن کے انتظار کے عذاب سے بچنے کے لئے ٹیکسی لے لی اور تین چار سو تو دوبارہ ٹیکسی لینے میں اڑ گئے، کھانا بھی اتنا مہنگا ہے۔ اب میں تین وقت نان پکوڑے تو نہیں کھا سکتا۔

اس کمپنی سے کانٹریکٹ حاصل کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ ابا جان کی ضد ہے ورنہ ایسی نامور کمپنیاں چھوٹے موٹے ناموں کو کہاں اہمیت دیتی ہیں۔ ابا جان اس بات سے ناواقف ہیں۔ وہ تو یہی سمجھیں گے کہ میں اپنی نااہلی کی وجہ سے یہ کام نہیں کر سکا۔ اس لیے ہر حال میں اس کانٹریکٹ کو حاصل کرنے کے لیے

چھوٹے عملے کو رشوتوں میں بھی کافی کچھ دینا پڑا۔ یہ بھی انہیں نہیں بتا سکتا، اس لیے میری جان! اپنے پیسوں میں سے چند ہزار اپنے اس بے چارے شوہر کی مدد کی غرض سے بچا کے رکھنا۔

وہ پانچ ہزار جو تم نے اپنی شاپنگ کے لیے دیئے تھے، تمہاری پسند کی تمام اشیاء لے لی ہیں۔ چار جٹ کے سوٹ، پرفیومز، لپ اسٹک، سینڈلز، ویسے یہاں بہت مہنگائی ہے۔ ہمارے بازاروں میں جو سوٹ دو چار سو کا آتا ہے، وہ انارکلی میں آٹھ سو کا ہوتا ہے...... خیر معیار کا بھی تو فرق ہوتا ہے سینڈلیں یہاں کے سب سے جدید بازار لبرٹی سے لی ہیں، ۔تینوں پانچ پانچ سو کی ہیں۔ میک اپ کے لیے تمہارے پیسے ختم ہو گئے۔ میں نے بھی تو تمہارے لئے کوئی تحفہ لینا تھا، اس لئے پرفیوم اور لپ اسٹک میں نے اپنے پیسوں سے خرید لی ہے۔

اپنا خیال رکھنا۔ میری غیر موجودگی میں کسی نئے معرکے سے ذرا پرہیز رکھنا۔ خصوصاً میری بہن سے بالکل نہ الجھنا وہ پاگل ہے۔ وقت پہ شادی نہ ہونے کی وجہ اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ نہ خود خوش رہتی ہے نہ کسی کو رہنے دیتی ہے۔ تم اس کی باتیں دل پہ نہ لیا کرو۔ ٹینشن سے تمہاری ساری خوبصورتی برباد ہو جائے گی۔

تمہارا بہت چاہنے والا شوہر

محمد رفاقت نعیم

عزیز دوست فرقان قریشی!

السلام وعلیکم، کیسے ہو میرے جگری یار

ارے کیا پوچھتے ہو۔ عیش کر رہا ہے تمہارا دوست۔

سالے! تو بھی اگر دو چار چھٹیاں لے کر میرے ساتھ لاہور آ جاتا تو یہ عیش دونوں مل کر کرتے۔ بچپن میں سکول سے اکٹھے بھاگ کر سینما دیکھنے اور میلے جانے کی یادیں تازہ ہو جاتیں۔

کبھی کبھار ایسے بھاگنے والے ڈرامے کرتے رہنا چاہیے، ورنہ کیا رکھا ہے ہم مردوں کی زندگی میں۔ ہم کسی کولہو کے بیل سے کم نہیں ہوتے۔ صبح سے رات تک گھر والوں کے لیے روٹی کمانے کے لئے مشقت کرو، رات سے صبح تک بیوی کے نازنخرے برداشت کرو، ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی اولاد...... سب غرض کے بندے ہی تو ہیں، ہر وقت امیدیں اور توقعات......

اب ابا جی کو دیکھ لو، چاہتے ہیں میں ایک، چار کے برابر کام کروں۔ ان کو تین اور ملازم نہ رکھنے پڑیں...... مگر کمائی آٹھ کے برابر ہو اور مجھے کیا ملتا ہے، ایک آدمی کی تنخواہ، اپنی ذرا ذرا سی ضرورتوں کے لیے اب تک ان کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ یہ چالاکیاں ہمیں انہوں نے ہی تو سکھائی ہیں۔ اب سیدھے طریقے سے گھی نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنا ہی پڑتی ہے۔ لاہور کی اسی کمپنی سے کاروبار کرنے کا خناس میں نے ہی ان کے دماغ میں بھرا تھا اور سچ بتاؤں، میرے ایک واقف کار نے بالا ہی بالا سارے انتظامات کر دیئے تھے،

کانٹریکٹ ہمارے ہی نام تھا۔ ویسے ہی ابا جان سے ڈرامے کر رہا تھا کہ دو تین میٹنگز کرنا ہوں گی، ہفتہ دس دن یہاں رہنا پڑے گا، یار! مجھے بھی تو ریلیکس چاہیے، یہ بہانہ گھڑنا پڑا اور اب تمہارا جگر پرسوں سے لاہور میں ہے، ابھی تو ابتداء ہے، اگلے پانچ چھ روز بھی بڑے ٹھاٹ سے گزرنے والے ہیں۔

کافی دنوں سے لاہور کے دورے کے لیے ابا جان کے حساب میں گھپلے کر رہا تھا، کافی ذخیرہ اندوزی کر رکھی تھی، جانتے ہو میں کہاں ٹھہرا ہوں، پی سی میں۔ حیران ہو گیا نا، مجھے پتا تھا۔ یار مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں پی سی کے آرام دہ کمرے میں رہ سکوں گا۔ ویسے یہ ہے میری استطاعت سے باہر۔ سوچا ہے بس آج کی رات رہ لوں۔ کل سے کسی اور اچھے درمیانے درجے کے ہوٹل میں رہ لوں گا۔ ویسے یہاں کے نظارے چھوڑنے کے قابل نہیں۔

ڈائنگ ہال میں انواع واقسام کے کھانے اور انواع واقسام کی ہی فیشن ایبل لڑکیاں...... سوئمنگ پول میں جلوے دکھاتی میمیں۔

آج رات وہاں جانے کا بھی پروگرام ہے...... وہیں...... بڑے بازار میں، پائے وائے کھائیں گے۔

میں نے تو یہ ہفتہ بھرپور گزارنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ لاہور کا ہر مقام ہر جگہ دیکھنی ہے، ہر عیاشی کرنی ہے۔ مہنگے سے مہنگا کھانا کھانا ہے۔ خرچے کی پروا نہیں ابا جان کو ٹوپی پہنانا کون سا مشکل ہے۔ ادھر شاہ عالمی سے سات آٹھ سو کا ڈنر سیٹ بہن صاحبہ کے اس جہیز میں اضافے کے لیے لے جاؤں گا جو پچھلے دس بارہ سالوں سے مکمل ہی نہیں ہو رہا، ابا جان کو قیمت چار ہزار بتاؤں گا۔ منرل واٹر کسی صراحی میں بھر کے دم والا پانی کہہ کر اماں جی کو دوں گا، پندرہ سو اس حساب میں کٹ جائیں گے۔ دو چار ہزار چند ضروری کاغذات بنوانے کے سلسلے میں دی گئی مد میں کٹیں گے۔ پانچ چھ ہزار میں نے بچا رکھے ہیں، اتنے ہی میری زمیندارنی، تھانیدارنی بیوی نے اپنی شاپنگ کے لیے دیے ہیں، خاک شاپنگ کروں اس کے لیے، اس کے اونٹنی جیسے ہونٹوں پہ ڈیڑھ سو والی لپ سٹک کے بجائے پچیس روپے والی ہی ٹھیک ہے، دو ہزار والے جوڑے بھی اس کے بھدے سراپے پہ بے کار ہی لگتے ہیں تو کیوں نہ اڑھائی سو والے جوڑے لے لیے جائیں۔ یار ادھر کی ریڑھیوں پہ لنڈے کی سنڈلیں سو سو روپے میں کیا شاندار ملتی ہیں میں نے تو تین لے کر پالش کروالی ہیں۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں میں اس بکواس ترین عورت کے لیے جو ابا جان نے پتا نہیں کس لالچ میں میرے سر منڈھ دی ہے، صرف اس کے نام لگے چند مربعوں کی وجہ سے۔

سچ تو یہ ہے جتنی خوشی یہاں عیش کرنے کی ہے اتنی ہی افسردگی، شبانہ کا تھوبڑا دیکھنے کی ہے۔

کاش تو بھی ہوتا۔ مل کے مزے کرتے۔ خیر آئندہ سہی۔ باقی تفصیل آنے کے بعد۔

تمہارا جگری دوست

محمد رفاقت نعیم

......❁......

تین عورتیں ایک کہانی

یہ کہانی پھاتاں کی ہے۔

پھاتاں...... جتنا پھٹا پرانا اس کا نام ہے، اتنی ہی بوسیدہ اس کی زندگی بھی ہے۔ گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلتے چوڑے پل کے نیچے اس کی جھگی ہے۔ جی ہاں وہ جگیوں کی مخلوق ہے جسے عرف عام میں ''چنگڑ قوم'' بھی کہا جاتا ہے۔ خیر اب وہ اتنی بھی چنگڑ نہیں رہی، اپنی دانست میں تو اس نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ اس کی ماں نانی کوڑا اٹھانے، کاغذ چننے یا پھر گھا گھرے ہلا ہلا کر گڑوی بجا بجا کے رُوپے دو روپے اکٹھا کرتی تھیں جبکہ وہ پل کے پرے والی نئی کالونی کی پوری چار کوٹھیوں پہ کام سنبھالے ہوئے ہے۔ بڑے گھروں کے کام بھی بڑے، ایک ہی کچن میں تین تین ملازم ہوتے ہیں ایک تو خانساماں، دوسرا اس کا مددگار سبزی بنانے اور مسالے پیسنے والا، تیسرا برتن دھونے والا۔ اسی طرح صفائی ستھرائی کے لیے بھی دو طرح کے ملازم رکھے جاتے ہیں۔

پھاتاں کا شمار نچلے درجے کے ملازمین میں ہوتا ہے۔ اسے ان کوٹھیوں کے سجے سجائے کمروں میں جانے کی اجازت نہیں، اس کے لیے دوسری ملازمہ ہے جو مشینی جھاڑو کے ذریعے قالین صاف کرتی ہے، قیمتی نازک چیزیں، نفاست سے جھاڑتی ہے اور سفید سفید چکنے غسل خانے عجیب عجیب خوشبودار دوائیاں ڈال کے دھوتی ہے۔ پھاتاں کے ذمے دوسرے کام ہیں۔ دو گھروں کے باہر کے برآمدوں، گیراج وغیرہ کی دھلائی، ایک گھر میں وہ کپڑے دھونے والی ماسی کی مددگار ہے اور وہ سبز کھڑکیوں والا بڑا بنگلہ، جس میں بڑی بیگم صاحبہ کی تین بہوؤں میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت اس کی طلبگار رہتی۔ چار سال سے وہ وہاں حاملہ خاتون کی ٹانگیں دبانے اور مالش کرنے کی تنخواہ لے رہی ہے۔

ماں اور نانی کی طرح تیز رنگوں کے لہنگوں کے بجائے بیگمات کے اترے فینسی شلوار قمیص پہن کر اپنے حساب سے تو اس نے ترقی ہی کی ہے نا۔ کھلے میدانوں میں کپڑے کی جھگی میں پلنے والی پھاتاں نے پکے

پل کے نیچے سرکنڈوں کی جھونپڑی ڈالی ہے۔ سر پہ حکومت کی بنائی مضبوط چھت پچھلی طرف کنکرٹ کی دیوار۔ نہ بارش کا ڈر نہ طوفان کا خوف۔

وہ خود کو خاصا جہاندیدہ سمجھتی ہے اور کیوں نہ سمجھے، کہتے ہیں جس نے ایک مرد پرکھ لیا، سمجھو جہان دیکھ ڈالا اور وہ تو تین تین مرد پرکھ بیٹھی ہے۔ ایک اس کا باپ، دوسرا اس کا شوہر اور تیسرا ابھی اس کا شوہر۔ تیرہ سال کی عمر میں پہلی بار اس کی شادی ہوئی۔ ایک جھگی سے اٹھ کے دوسری جھگی میں چلی آئی، ہاں البتہ جس جھگی میں آئی تھی وہاں کھڑی سائیکل اس کے ابا کی پرانی جھگی میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے نئے مالک نے اسے بھی کھٹارا پرزوں والی بے جان سائیکل ہی سمجھا۔ اتنے تیز تو کسی سائیکل کے پیڈل پہ کسی کے پیر نہ چلتے ہوں گے جتنے اس کے ٹھڈے پھاتاں کی پیٹھ پہ برستے۔ الہڑ چنچل اور کھلے بندوں سڑکوں پہ کھیل کے پلنے والی پھاتاں کی زبان بھی تو ایسے چلتی تھی کہ اسے بریک لگانے کے لیے بے چارے شوہر کو ہاتھوں پیروں دونوں کا زور لگانا پڑتا۔ دھموکے، گھونسے، طمانچے اور لاتیں کھا کھا کے اس کا سانولہ کچے جامن سا بدن پک کے چند ہی سالوں میں بدنما سے کالے سنگھاڑے میں تبدیل ہو گیا۔

اس سے عمر میں پچیس سال بڑے شوہر کو ٹی بی تو شادی کے اگلے ہی برس لگ گئی تھی۔ بے چارہ اب نہ تو تسلسل سے گالیاں بک پاتا تھا نہ ہی دل لگا کے مارنے کی سکت رہی تھی یعنی اسی فیصد شوہرانہ حقوق تو نامراد کے مارے گئے، باقی بیس فیصد اس نے خود وصولے اور پانچ ہی سالوں میں چار بچے دے کر مر گیا۔ آخری دنوں میں کم بخت نے پھاتاں کا اتنا خرچہ کروا ڈالا کہ دونوں چھوٹے بچے بھوک اور بیماری سے لڑ نہ سکے اور باپ کے پیچھے پیچھے ہی چل پڑے۔ کیا کرتے...... ماں کو کام سے فرصت نہ تھی اور بڑے بہن بھائیوں کو بچے ہوئے گلے سڑے پھل چننے کی مصروفیت رہا کرتی۔ پانچ ماہ اور سوا سال کی عمر کے دونوں بچے اپنے حصے کا رزق خود کوڑے کے ڈھیر سے چننے کے قابل ہوتے تو شاید بچ ہی جاتے۔

اسی سال برادری والوں نے، جی ہاں ان کی بھی برادری ہوتی ہے اور آپ کی ہماری برادری کی طرح یہ بھی مشکل میں کام آئے نہ آئے، مشکل آسان ہو جانے یعنی موت آنے کے بعد ضرور اکٹھی ہوتی ہے۔ ہاں تو برادری والوں نے انیس سالہ پھاتاں کو پھر سے بیاہ دیا لیکن اس بار اسے دوسری جھگی نہ جانا پڑا بلکہ اسی جھگی کے کونے میں پڑا رہنے والا سولہ سالہ دیور اب اس کا مجازی خدا تھا۔ وہ مجازی خدا جس نے شروع میں تگڑی بھابی کی بڑی ماریں کھائیں، پہلے چرس کا سوٹا لگانے، پھر دیسی شراب چڑھانے پہ، وہ تو قدم بہ قدم بڑھتا گانجے سے افیم اور اب ہیروئن پہ آ گیا، بھابھی میں بھی دم خم نہ رہا۔ بھائی نے مرتے مرتے اس کی ہڈیوں تک سے جان نچوڑ کر پھوک کر دی تھی اور اب یہ مسلی، نچڑی، تھوکی ہوئی عورت اس پہ کالک کی طرح مل دی گئی۔ پیلے بڑے بڑے دانت، چندی آنکھیں، چمرخ کھردرے ہاتھ، لیروں لیر پھٹی ایڑیاں...... وہ انکار کرتا تو برادری

والے اتے جوان بھابھی کے ساتھ رہنے سے انکار کرتے ہوئے جھگی سے نکال دیتے اور نشے سے ڈولتے جسم کو کہاں گھسیٹتا پھرتا اس میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اپنی نفرت اور غصے کا اظہار ہاتھ چلا کے ہی کر لے۔ نشے سے دھت کبھی وہ اس کے قریب آ بھی جاتا تو ہوش میں آتے ہی کراہیت کے ساتھ بے جان سی ٹھوکر مار کر پرے کرتا ہوا باہر نکل جاتا۔

پانچ سال تک روئی کی طرح دھنکی جانے والی پھاتاں اپنے جوان شوہر کی ہلکی سی ٹھوکر کو ہنس کے سہہ لیتی، مار کھانے میں اسے قطعی اعتراض نہ تھا جو بھی تھا آج وہ عزت سے تو اپنی جھگی میں بستی ہے۔ اپنی جوان ہوتی لڑکی کو بغیر کھٹکے چھوڑ کے کام کو نکل جاتی ہے جانتی ہے پیچھے بیٹھا ہوا اس کا سگا باپ نہ سہی سوتیلا ہی سہی مگر چچا تو سگا ہی ہے۔ کسی اور سے بیاہ کرتی تو یہ ڈر الگ لگا رہتا۔ پھر کیا تھا جو وہ نشہ کرتا تھا کوڑا بولتا تھا، تیکھا دیکھتا تھا ہاں مگر کبھی کبھی وہ بھی بگڑ جاتی جب وہ زبردستی اس کی محنت کی کمائی ہتھیا لیتا یا انکار کرنے پر گھر کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کے لے جاتا۔ کبھی منجی، کبھی دیگچی، کبھی کھیس، تب وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کے اسے کوستی۔ وہی جانتی تھی کس کس طرح چھ بچوں کا پیٹ بھرنے کے بعد وہ پائی پائی جمع کر کے کوئی چیز لے پاتی ہے۔ جی ہاں بڑے بھائی نے غصے ہی غصے میں تو چھوٹے نے نفرت ہی نفرت میں چار چار بچے پیدا کیے۔ یعنی سکور برابر رہا۔

آج کل پھاتاں کو نیا شوق چڑھا ہے اپنے بچوں کو پڑھانے کا۔ نئی کالونی کی سیدھی سڑک پہ ایک بی بی نے این جی او قائم کی ہے، جس کے مقاصد میں سرفہرست غریب بچوں کو مفت تعلیم مہیا کرنا ہے اور اس کے ساتھ بڑے پل کے نیچے ایسی بہت سی مخلوق ہے جن پہ وہ اپنے شوق پورے کر سکتی ہیں۔ سجی سنوری بیبیاں، عینکیں چڑھائے، خوشبودار رومال ناک پہ رکھے ایک ایک جھگی میں جاتی ہیں بچوں کو رنگین تصویروں والی کتابیں دکھا کے، لبھانے کی کوشش کرتی ہیں ایک ایک میٹھی گولی تھما کے اپنے ماں باپ سے سکول جانے کی ضد کروانے کا وعدہ کر لیتی ہیں۔ اجڈ قسم کے لوگوں کو تعلیم کی افادیت پہ لیکچر دیتی ہیں۔

خیر ان کی روز کی سر کھپائی کا اتنا نتیجہ نکلا کہ پھاتاں اور اس جیسی چند اور عورتیں اپنے ننھے اکٹھے کیے ان کے پیچھے پہنچ گئیں۔ پھاتاں صرف تین بچوں کو ساتھ لا سکی۔ بڑا بیٹا جو پہلے شوہر سے تھا اب ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا اور بیس پچیس روز کما کے لاتا تھا۔ اس سے تو اب وہ دبنے لگی تھی اس لیے ذکر ہی نہ کیا، اس سے چھوٹی لڑکی جو اب گیارہ سال کی تھی وہ بھی بڑی مشکل سے ساتھ آنے پہ تیار ہوئی، اس سے چھوٹے دونوں لڑکے بھی بڑے بدزبان تھے اور کسی ہوٹل پہ کام کرتے تھے۔ جو روپے دو روپے کماتے وہیں فلمیں دیکھ کے اڑا دیتے یا بہت ہوا تو کبھی بچا ہوا سالن لے آتے، وہ بھی ہتھے نہ چڑھے۔ سب سے چھوٹا پانچ سال کا بیٹا چھکو اٹھا لائی۔ گود کی لڑکی ذرا بھی قابل ہوتی تو مارے شوق کے اسے بھی داخل کرا ہی دیتی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' بڑا سا رجسٹر کھولے موٹے شیشوں کی عینک پہنے وہ پکی عمر والی عورت ان

کوٹھی والی بی بیوں جیسی نہیں لگ رہی تھی، البتہ لہجے کا رعب اور چہرے کی کرختگی و بیزاری بتا رہی تھی کہ وہ ضرور استانی ہو گی۔

''پھاتاں۔''

''کیا؟ اصل نام بتاؤ اپنا؟'' وہ ڈپٹ کے بولی۔

''پھاتاں جوجہ دلاور'' اس کی نظر میں تو یہی اصلیت تھی نااس کی۔

''جوجہ صاحبہ! اپنا اصل نام بتائیے، یہ کیا نام ہوا پھاتاں چھاتاں، فاطمہ ہے تمہارا نام؟'' اس نے قیاس کیا۔

''ناں جی، پھاطمہ کیوں؟ پھاتاں ای اے مارا ناں۔'' اسے فاطمہ جیسا دھلا دھلایا نام اپنی بوسیدہ ہستی کے لیے موزوں نہ لگا۔

''اچھا، یہ لڑکی ہے تمہاری؟ کیا نام ہے اس کا۔''

''ساداں......''

''چلو اس کا بھی۔ بھئی سکول میں یہ قافیے نہیں چلیں گے کوئی ڈھنگ کا نام بتاؤ۔ شاداں کا نام میں ''شاہدہ لکھ لیتی ہوں۔'' وہ کچھ سوچ کے بولی۔

''ہاں جی ٹھیک اے۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''لکھ لو جی سیداں ولد آسق''

''بہت اچھے۔ تم زوجہ دلاور اور لڑکی تمہاری، کسی عاشق صاحب کی اولاد۔'' پیچھے کھڑی دونوں پکی عمر کی لڑکیاں کھی کھی کھی کرتی ایک دوسرے کے کندھے پہ گرنے لگیں۔

''کیوں مسز ہارون! میں نہ کہتی تھی، اتنی تباہ کاریاں کسی ایک بندے کا کام نہیں۔'' میک اپ سے لپی بھاری بھرکم سی عورت نے شوخ لہجے میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

قسمت کی بات ہے اسی رات دلاور بھی ذرا کم لڑکھڑاتا ہوا آیا۔ وہ نشے میں دھت کہیں گرا پڑا رہتا تو پھاتاں کو وارے کھاتا تھا۔ ذرا ہوش میں آیا نہیں، جان عذاب میں ڈال دیتا۔ اسے پتا چلا کہ وہ دو بچے سکول بھرتی کرآئی ہے تو دم پہ چوٹ کھائے کتے کی طرح جھگی میں گھوم گھوم کے بھونکنے لگا۔

''تیں دو ٹکے کی جنانی، اتنے بڑے بڑے پھیصلے کرنے لگ گئی۔ رانڈ ہے تو؟ کھسم مر گیا ہے کیا دوسرا بھی؟ بچے کیا اکیلی تیں نے جنے ہیں؟ میں باپ نہیں ان کا؟''

''ہائے ہائے کیا بچے بیچ کے آئی ہوں میں اور تیں آج یاد آیا کہ ان بچوں کا باپ کون ہے۔ آج سے پہلاں تو کھیال نئیں آیا ان کا۔ جب موٹر کھانے بھرتی کرایا کالو کو تب تو نیں نہ بولا۔ نکو اور بھولو کو تندور پانڈے

دھونے بٹھایا تب بھی چپ رہا۔ بد بخت کیا کھاتے، کیا پاتے کج کھمبر رکھی تیں نے۔ آیا بڑا باپ بننے۔'' وہ بھی طیش میں آ گئی۔ آج ہی تو بی بیوں نے شرم دلائی تھی اسے کہ ایک تو آوارہ، چرسی، نکھٹو، شوہر پالا ہوا ہے۔ اس کو کھانے کو روٹی، چسکے کو نشہ، سونے کو جگہ دیتی ہو اور پھر مار بھی اس سے کھاتی ہو۔

''تیں بڑی زبان چلائے ہے آج سسری...... کج کہوں نا میں تو سر پہ چڑھتی جاوے۔'' وہ چولہے سے ادھ جلی لکڑی اٹھا کے اس پہ لپکا۔

''اب نہ تیرا جلم چلے دلاور!'' وہ گرما گرم تو اتان کے کھڑی ہو گئی تو دلاور ڈھیلا پڑ گیا۔

''کالی رانڈ، منوس، کھسم پہ ہاتھ اٹھائے، دوجکھ میں جائے گی سیدھی۔'' وہ عورتوں کی طرح کوسنے بیٹھ گیا۔

''ناں تو اب کہاں ہوں سارا دن تو ڑوں، گرمی سردی کھاؤں پھر چار پیسے لاتی ہوں، مپھت میں پڑھ جائیں گے، تیرا کیا جاتا ہے نامراد۔''

''ساری ساری جندگی روئے گی تیں، یہ سسرے پڑنے لگ گئے تو کام نہ کریں گے۔ ہڈ حرام، ہو جاویں گے۔''

''تیری تریوں۔'' وہ پھنکاری تو اپھر بلند ہو گیا۔

''میں سب جانوں تو کیا سنا رہی ہے، تیں مجھے جورو کا گلام سمجھے؟ کج کہتا نئیں میں اس لیے بھڑوا جانے ہے مجھے، ہائے ری کسمت! بھائی کوٹی بی لگا دی اس مردار نے اب مجھے چمٹ گئی۔ کیسی کیسی حوراں پھدا ہیں دلاور پہ اور یہ بڈھی ناشکری کرے۔''

حوروں کے ذکر پہ پھاتاں ذرا کھٹکی، اسے سن گن تو کئی دنوں سے مل رہی تھی کہ دو جھگی پرے رہنے والی چھمی کا بڑا گٹھ جوڑ ہو رہا ہے آج کل دلاور سے۔ جب وہ کام پہ ہوتی ہے تو چھمی کبھی پھل، کبھی چائے کبھی داتا دربار سے لائے چنوں والے چاول لے کے آتی ہے اور دونوں گھنٹوں گپیں لڑاتے ہیں۔ چھمی بھی اسی کی عمر کی تھی مگر زیادہ رگیدی نہیں گئی تھی اس لیے دم خم باقی تھا۔ ایک اکیلی جان تھی اس کی، سو زیادہ مارا ماری بھی نہیں کرنی پڑتی تھی چند گھنٹے داتا کی نگری لگا آتی اور گزر ہو جاتی اس لیے حالت بھی سنوری ہی رہتی جب کہ پھاتاں تیس کے قریب تھی اور چالیس سے اوپر کی لگتی تھی۔

چوبیس سالہ بھرپور جوانی کو اب اس میں رتی بھر دلچسپی نہ تھی۔ مطلب تھا تو صرف سر پہ چھت اور نشے پانی کی رقم سے اب وہ نسبتاً اچھی جگہ سے مل جاتا تو اسے کیا اعتراض تھا، کام میں لگ کے پھاتاں کو ان افواہوں پہ دھیان دینے کا خیال نہ آیا لیکن اب خود اس کی زبان سے یہ لن ترانیاں سن کے ٹھٹک گئی۔

''کونسی اندھی حوراں ہیں جو تیں پہ پھدا ہو گئیں۔''

''اری کوئی ایک ہے۔ ایک تو سرکس والی جو سال پرے میلے میں آئی تھی، کہتی تھی جہاں میلہ جائے گا تیں ساتھ رکھوں گی۔ شیزادہ بنا دوں گی۔ میں نے جانے کا حوصلہ نہ کیا۔ وہ کالی کوٹھی کے کھانساماں کی رن، روج کہے ہے آ بھاگ چلیں۔ گہنے روپے سب ہیں میرے پاس تیں عیس کراؤں گی۔ چلا جاؤں گا کسی روج اس کے ساتھ یا چھمی کی جھگی جا بسوں گا۔ گریب بے سہارا ہے۔ نہ مرد نہ بچہ، جوان کھبسورت، ایسی مٹھی زبان ہے۔ ایک تو، کالا منہ۔ کالی زبان منے کوئی مجبوری نئیں، تین بچے کام سے نہ لگاوے گی۔ پڑانے بھیجے گی تو کھرچا کیسے پورا ہوگا۔''

''اپنے جا تو نکل کے تو دکھا۔ تیں ذوجی سانس نہ آوے۔ تیں بارات نکلانے کی سوچے میں جنا جا نکال دوں تیرا۔ بات کرتا ہے۔ سکل دیکھ اپنی وہ سرکس والی میم تجھے شیزادہ بنائے گی۔ ارے ہیجڑا بنا کے ناچ نچوائے گی میلے میں تیرا۔ پرتیں تو وہ بھی کرنے کے قابل نئیں۔ وہ کھانساماں کی رن، چور کی بچی، لمبا ہاتھ مارنا ہوگا۔ کوٹھی والوں کے ہاں اس لیے تیں کو آگے کر رہی ہے تاکہ پکڑی جائے تو تیں کا نام لے کے کھود بچ جائے، اور وہ چھنال چھمی ......''۔

یہاں آ کے وہ رک گئی۔ دل ہی دل میں اس کی باتوں سے خوفزدہ ہونے کے باوجود اس کی عقل تسلیم نہیں کرتی تھی کہ کوئی عورت دلاور کے مدہوش، میلے اور ناکارہ وجود کے لیے اتنا تڑپ سکتی ہے۔ وہ اسے محض اپنی مردانگی کی دھاک بٹھانے والی گپیں سمجھ کے جھٹلانا چاہتی تھی مگر چھمی ...... وہ جس قسم کی عورت تھی تقریباً سب ہی جانتے تھے اب شاید وہ کھل کھلا کے سامنے آنا چاہتی تھی مگر اکیلی ہونے کی وجہ سے ہمت نہ کر پا رہی۔ ایسی عورتوں کو ایسے ہی برائے نام مردانگی رکھنے والے مرد چاہیے ہوتے ہیں، جن کا منہ چند روپوں سے بند ہو جاتا ہو اور جن کی غیرت ایک ہی سوٹے میں دھواں ہو جاتی ہو۔ کیا پتا وہ سچ مچ چارہ ڈال رہی ہو۔ یہاں آ کے وہ سہم جاتی۔

''اگر اس کے نشہ پانی میں ذرا بھی کمی ہوئی تو وہ رسیاں تڑوا لے گا۔ پھر...... پھر یہ چھ جانیں...... کس کا نام ہوگا اس کے سر پہ۔ اور میں جو سرا اٹھا کے روز کام پہ نکلتی ہوں کیسے خود کو بچاؤں گی اور کیسے گھر بیٹھی جوان ہوتی لڑکی کی حفاظت کروں گی۔'' وہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

''میں کہے دیتا ہوں بوت من مانی کر لی تیں نے۔ اگر مجھے ساتھ رکھنا ہے تو میری ماننی پڑے گی۔ لڑکی کو اپنے ساتھ کام پہ لگا اور چھکو کو سویرے کریمو کے ساتھ بھیج۔ اس کی نان چھولے کی ریڑھی کے ساتھ جائے گا کوئی کام نہیں۔ صرف گراھکوں کو پلیٹیں پکڑانی ہوں گی۔ کھرچا کھلا آئے گا گھر میں تو تیری بھی آسانی ہے۔ نہیں تو...... تجھے اور بھتیری۔'' وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''اماں......! اماں......!'' چھکو پکارتا ہوا جھگی میں داخل ہوا۔

''اماں......! سویرے بھیدا بھی میرے ساتھ جائے گا سکول۔ اس کی اماں نے بستہ سیا ہے اس کے لیے۔ میرے لیے بھی ویسا ہی بستہ سی دے نا اماں۔'' وہ پلو پکڑے بے جان مورت کی طرح کھڑی ماں سے لاڈ کر رہا تھا کہ ماں کے دھمو کے اس پہ ناگہانی آفت کی طرح برسنے لگے۔

''سکول جائے گا تیں سکول جائے گا، اتنی اوقات تیری، نشئی کا بچہ، چرسی کی اولاد، تیں پڑھے گا۔ افسر لگے گا، کل سے ریڑھی کے ساتھ جا اور چھولے بیچ سمجھا، اوری، چھوری! وہ چادر میں لا میں تجھے اس کی دو اوڑھنیاں بنا دوں کل سے تو بھی میرے ساتھ کام پہ نکل۔''

☆

اور یہ کہانی ہے نورین کی۔

یہ ٹھیک ہے کہ نورین بھی ایک شادی شدہ عورت ہے وہ بھی ایک ماں ہے اس کی عمر بھی ستائیس اٹھائیس سال ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی اور پھاتاں کی کہانی کو آپ ایک جیسا سمجھ لیں۔

نورین نے تھرڈ ڈویژن میں بی۔ اے کر رکھا ہے۔ وہ سلائی کڑھائی، کھانا پکانا جیسے امورِ خانہ داری میں طاق ہے اس کے باپ نے اچھرے میں کپڑے کی دکان کھول رکھی ہے جب کہ جوانی کے پندرہ سال اس نے کویت میں لگائے اور ڈیزل، گریس اور پسینے کی بو سے بسے ریالوں سے دونوں بیٹیاں بیاہیں۔ نورین کی بڑی بہن شاہین بیاہ کر فیصل آباد چلی گئیں اور خود نورین مزنگ کے پُر رونق بازار کی دکانوں کے اوپر بنے چھوٹے سے تنگ و تاریک مکان میں چلی آئی۔ اس کا شوہر فاروق گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں ٹیچر ہے۔ شام کو وہ گلبرگ کے ایک مہنگے کوچنگ سنٹر میں بھی کلاسز لیتا ہے۔ اس کی اصل کمائی یہی ہے گورنمنٹ جاب کی تنخوا پر اکتفا کرتا تو مہینے کے پندرہ دن فاقے ہی کرنے پڑتے۔ اب بھی اس کی دگنی محنت اور بیوی کی سمجھ داری کفایت شعاری کے باوجود کھینچ تان کے ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ مکان اپنا ہے اگرچہ چار کمروں کے مکان کے درمیان موجود مختصر سا پکا صحن اسے دو دو کمروں میں تقسیم کرتا ہے سامنے والے حصے میں نورین کا جیٹھ اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ رہتا ہے اور بقایا دو کمرے ان کے پاس ہیں۔ تین بچوں کے ساتھ فقط یہ دو کمرے ناکافی محسوس ہوتے ہیں لیکن کرائے کے جھنجھٹ سے تو آزادی ہے۔ ایک سسر ہے جس کے لیے صحن کے او گرل کی چھت لگا کے کمرے کی شکل دے دی گئی ہے۔ دھوپ اور بارش سے بچاؤ کی خاطر گرل پہ ترپال ڈال دی جاتی ہے۔ یہی اس کا ٹھکانا ہے۔ ساس کا ساتھ اس کی شادی کے ابتدائی دو سال تک ہی رہا لیکن ان دو سالوں میں وہ اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلا گئی۔ شاید اسے بھی پتا تھا کہ اس کے دن تھوڑے ہی رہ گئے ہیں اور اسے جو کرنا ہے ان ہی دنوں میں کرنا ہے لہٰذا اس نے اپنا رول بخوبی ادا کیا۔

اس کا جیٹھ ان مردوں میں سے تھا جو بظاہر بیویوں پہ حاوی نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت ان کی ڈور

کی بیویوں کے ہاتھ ہی ہوتی ہے۔اس کی آواز ہمیشہ بلند رہتی تھی۔گھر میں داخل ہوتے ہی وہ اِدھر اُدھر چیزوں کو ٹھوکریں مارتا آگے بڑھتا۔بیوی کے پھوہڑ پن اور بد سلیقگی کو کوستا، کھانے میں ہزار نقص نکالتا کسی نہ کسی بات پہ الجھ کے دو چار گالیاں نکالتا۔اپنی مردانہ اور شوہرانہ ادائیں اچھی طرح دکھا لینے کے بعد ٹھنڈا پڑتا تو بیوی سے اگلے دن کی تمام ٹیوشن لیتا۔سارے سبق پڑھتا اور ایک اچھے شوہر کی طرح ان پہ عمل کرتا۔اس کی بیوی نے کبھی دونوں بھائیوں کے درمیان اچھے تعلق نہیں قائم ہونے دیے۔کہنے کو وہ ان کی اپنی برادری کی ہے۔چچازاد مگر خون کے رشتوں پہ اس نے ہمیشہ سسرالی رشتوں کو اہمیت دی اور سسرالیوں سے کیسا حسنِ سلوک رکھا جانا چاہیے۔اس کی تربیت اسے اپنی ماں سے جو ملی تھی وہی وہ نباہ رہی تھی۔

ان کا کاروبار خاصا چلتا تھا، بیٹا بھی ایک ہی تھا یعنی چھوٹے بھائی کی نسبت خاصے خوشحال تھے، دونوں کمرے ہر طرح کے سامان آسائش سے بھرے پڑے تھے۔چاہتے تو اچھا خاصا مکان لے کر الگ رہ سکتے تھے لیکن صفیہ بی بی کا خیال تھا کہ جائیداد سے حق نہیں چھوڑنا چاہیے۔الگ رہنے کا مطلب ہے کہ اس مکان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔چنانچہ وہ مکان کے بکنے اور اپنا حصہ ملنے کے انتظار میں ان ہی دو کمروں میں ٹھنسے پڑے تھے۔لیکن نورین کے سسر حاجی نورالدین صاحب بھی کوئی احمق نہ تھے کہ اپنی زندگی میں ہی یہ واحد جائیداد بیچ کے دونوں بیٹوں میں بانٹ دیتے اور اس چھلنی نما چھت سے بھی محروم ہو جاتے۔اس گھر کے قانونی مالک ہونے کے باوجود یہاں ان کے لیے جگہ بس ایک چارپائی برابر ہے تو بھلا بیٹیوں کے گھر کتنی ملے گی۔

ان کی دو وقت کی روٹی بھی دونوں بیٹوں میں بٹی ہوئی ہے، دوپہر کی صفیہ کے ذمے تو رات کی نورین کے۔صفیہ بھی ایک نمبر کی خرانٹ ہے، سجاد رات کا کھانا گھر پہ کھاتا ہے اس لیے رات کے کھانے میں خوب اچھی چیزیں بنا لیتی ہے۔دوپہر کو پکانے کا تردد نہیں کرتی،کبھی لسی،کبھی چٹنی،کبھی پکوڑے بنا لیے۔یہی کھانا سسر کے آگے رکھ کے دونوں ماں بیٹا رات کا بچا سالن گرم کر لیتے۔نورین باورچی خانے سے کھانے کی ٹرے لے کے سسر کے سامنے سے گزرتی تو انہیں تندور کی سخت روٹی لسی میں ڈبوتے دیکھ کر سخت شرمندگی محسوس کرتی لیکن فاروق کے ڈر سے چپ چاپ کھانا لیے اندر آ جاتی کہ اس کے خیال میں اس وقت کی ذمہ داری ان لوگوں کی نہیں اگر آج وہ کھانا دے دیں گے تو بھابھی کل سے ہی ہاتھ کھینچ لیں گی۔

عجیب بے حس تھے دونوں بھائی، ایک بوڑھے آدمی کا ایک وقت کا کھانا ہوتا ہی کتنا ہے جسے وہ وجۂ تنازعہ بنائے ہوئے تھے۔بہر حال دن کو شوہر کی غیر موجودگی میں وہ حاجی صاحب کو چائے، شربت پھل پوچھ لیا کرتی تھی۔بدلے میں اسے جو دعائیں ملتیں وہ صفیہ کو اور کلساتیں، ان ناز برداریوں کو وہ مکان ہتھیانے سے گر جانتی اور مزید سختی سے اپنا مورچہ سنبھال لیتی۔

فاروق کو اگر ہماری تمہاری نظر سے د... تو خاصا معقول شوہر نظر آتا ہے۔بے ضرر سا، خاموش طبع،

محنتی، گالم گلوچ کی اس کی عادت نہیں، اونچی آواز، اس کی نکلتی نہیں۔ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات ہے لیکن منہ ہی منہ میں بڑابڑاتے ہوئے وہ کیسی کیسی نوکیلی باتیں کہہ جاتا ہے یہ صرف نورین ہی سن پاتی ہے۔ اس کا واحد ٹارگٹ نورین کے بے چارے گھر والے ہیں جو سات محلے پرے رہتے ہیں لیکن فاروق کی نکتہ چینیوں سے محروم نہیں۔ یوں بھی اسے ''داماد'' یا ''جوائی'' بن کے رہنے کا بڑا شوق ہے اتنا کہ پچھلے آٹھ سالوں میں یہ اترنے کی بجائے مزید بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

ہر ہفتہ دس دن بعد وہ نورین کے سر ہو جاتا ہے کہ بچے لے کے میکے ہو آؤ، وہ بے چاری جز بز ہوتی رہتی، جانتی تھی کہ واپسی پہ وہ ہمیشہ اس کے لدے پھندے ہونے کی توقع رکھتا ہے جبکہ وہ ماں باپ کو نوچ کھسوٹ کے اب تنگ آ چکی تھی۔ پچھلے آٹھ سال میں وہ ہر عید، شب برات حتیٰ کہ بچوں کی سالگراہوں پر پوری فیملی کے کپڑے، تحائف دیتے چلے آ رہے ہیں۔

ہر بچے کی پیدائش ننھیال میں ہوئی ہے۔ یعنی تمام خرچہ انہوں نے ہی اٹھایا ہے، ویسے بھی وہ مہینے دو مہینے بعد چکر لگا لیتے تو کچھ نہ کچھ لیتے آتے۔ لیکن فاروق کو یہ بھی ناکافی لگتا ہے۔ وہ اٹھا اٹھا کے ہر چیز بغور دیکھتا اور سو سو کیڑے نکالتا۔ بچوں کے نئے کپڑوں پہ اسے سالوں کے بچوں کی اترن کا گمان ہوتا۔ اپنے لیے لائے سوئیٹر اور شرٹیں اسے لنڈے کی لگتیں، یہ الگ بات کہ وہ خود اور اس کے بیوی بچے عموماً انہی کپڑوں میں ملبوس نظر آتے کہ اس کی اپنی تنخواہ، کچن، بجلی، پانی کے بل، سکول کی فیس اور خود اس کے آنے جانے کے کرایوں کو پورا کرنے میں ہی کافی ہو جاتی، شاپنگ اور وہ بھی اِس قدر ''غیر ضروری'' ناممکن...... یہ تو اس کے میکے کی خوشحالی تھی کہ عید بقرعید پہ اس کے بچے نئے کپڑوں میں نظر آتے۔ خاندان میں ہونے والی تقریبات میں بھی اس کا بھرم رہ جاتا اور تب اس کا کلیجہ جل جاتا جب فاروق اپنے یہ پسندیدہ ترین فقرے دُہراتا۔

''لوگ کیا کیا نہیں کرتے بیٹیوں کے لیے، میکے والے تاعمر سہارا دیتے ہیں، یہاں یہ معاملہ ہے کہ خود تو گھر میں دو دوا ے سی لگا رکھے ہیں، بیٹی کی پروا ہی نہیں، نا ہی اس کی اولاد کی جو ساری گرمی میں جسم گلا لیتے ہیں اور وہ تمہارے بھائی اپنے بچے اونچے سکولوں میں داخل کرا رکھے ہیں بہن کے بچوں کی فیسیں کہاں سے پوری ہوتی ہیں۔ کبھی سوچا انہوں نے باپ تمہارا روز گاڑی میں بیٹھ کے دکان جاتا ہے، کیا اتنا نہیں کر سکتا کہ داماد کو کوئی سیکنڈ ہینڈ سکوٹر ہی خرید دے، خون سفید ہو گیا ہے تمہارے گھر والوں کا۔''

وہ دل ہی دل میں کلستی چپ چاپ سن لیتی۔ اس کے تین بھائی کماتے تھے اور باپ بھی ابھی ریٹائر ہونے کی عمر میں نہیں آیا تھا، ظاہر ہے خوشحالی اور فراغت ہونی ہی تھی، لیکن ایسی روپے کی ریل پیل بھی نہیں تھی کہ لٹاتے پھرتے۔ اپنے طور پہ انہوں نے بہنوں کی شادیوں پہ دل کھول کے جہیز دیا تھا، بڑی بہن کی شادی بارہ سال پہلے ہوئی تھی۔ لیکن نورین کی شادی پہ وقت کے تقاضے کے مطابق انہوں نے الیکٹرک سامان زیادہ

تعداد میں دیا تھا۔ ٹی وی، فریج، واشنگ مشین، ڈیک، فرنیچر بھی ضرورت کے مطابق مکمل تھا۔ زیور بھی پورے پندرہ پندرہ تولے پڑا تھا دونوں بہنوں کو لیکن فاروق...... آئے دن اسے اپنی پہلی منگنی کے ختم ہونے کا قلق ستاتا رہتا۔ وہ بچپن سے اپنی پھوپھی زاد نگینہ سے منسوب تھا۔ پہلے ہی اس فربہ اندام کم قامت احمق سی دکھنے والی منگیتر میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی تھی اور جب گورنمنٹ سکول میں ٹیچر تعینات ہوتے ہی نگینہ کے تیسری بار میٹرک میں فیل ہونے کی خبر سنی تو ماں سے لڑ جھگڑ کے یہ منگنی تڑوالی۔ وہ کسی کم پڑھی لکھی لڑکی سے شادی پہ تیار نہ تھا اسی لیے اس کی ماں نے بی اے پاس سلجھی ہوئی، باوقار سی نورین کو پسند کیا۔ تب فاروق بھی خوش تھا۔ ابتدائی دواڑھائی سال کچھ ہلکی پھلکی تلخی کے باوجود خوشگوار تھے۔

اگرچہ فاروق کے ظاہری کردار کا پردہ جلد ہی چاک ہو گیا تھا اور اس کے اندر کا وہی پرانا، کونے کھدروں سے اعتراض ڈھونڈ ڈھونڈ کے لانے والا اور سسرال کے مال پہ نظر رکھنے والا مرد جاگ گیا تھا۔ پھر بھی گزارا ہو ہی جاتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے غیر مطمئن بہر حال نہیں تھے لیکن جب سے نگینہ کی شادی ہوئی تھی...... اور فاروق نے اس کے جہیز میں ملنے والی چمچماتی گاڑی اور دس مرلے کے پلاٹ کا ذکر سنا تھا، وہ اپنا سر پیٹ پیٹ کے اپنی جلد بازی پہ پچھتاتا اور غلط فیصلے کو کوستا۔ نورین کھلے عام یہ تبصرے سن سن کے شرمندہ ہوتی رہتی اور جب سے نگینہ بیوہ ہو کے آئی تھی وہ مزید سہم گئی کہ اب اس کے پاس مرحوم شوہر کا چھوڑا ہوا ترکہ بھی تھا۔ اور اگر...... کہیں...... خدانخواستہ...... وہ لرز جاتی اور اپنی ساری انا، خود داری لپیٹ کے بی اے کی ڈگری کے ساتھ ہی بند کر دیتی اور میکے جانے کا سامان کرتی۔

آج بھی وہ تین دن رہنے کے بعد اپنے گھر واپس آئی تھی اور حسبِ سابق لدی پھندی تھی، گھی کا کنستر، بسکٹ کے پیکٹ، مرغیاں، انڈے، جیم اور کیچپ کی بوتلیں کچن میں ٹھکانے لگانے کے بعد اب وہ بھابیوں کے دل سے اترے لان کے سوٹ پھیلائے بیٹھی تھی کہ کس طرح انہیں فٹ کر کے اپنے پہننے کے قابل بنائے کہ اس کی خالہ ساس نرگس خاتون آ گئیں۔ ان کا بطورِ خاص اپنے کمرے میں آنا محسوس کر کے وہ ٹھٹکی، وہ بھی چند اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جلد ہی مطلب کی بات پہ آ گئیں۔

''آئے ہائے نورین! اچھی بھلی سمجھدار ہو، تم سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں تھی مجھے۔ کیے، مرد کو بے مہار چھوڑا ہوا ہے۔ مانا کہ فاروق بیبا بچہ ہے لیکن مرد کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے خاص طور پر جب بیوی جانتے بوجھتے اندھی اور گونگی بہری بنی ہو''۔

''لیکن...... میں نے کیا کیا ہے خالہ جان؟'' وہ حیران تھی۔

''بیٹی تم نے تو کچھ نہیں کیا لیکن تمہارے بھولپن اور سادگی سے فائدہ اٹھا کے وہ حرافہ نگینہ تمہارے میاں کو خوب جکڑ رہی ہے آج کل۔'' وہ اس کی لاعلمی پہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

''کیا مطلب؟ فاروق کو.....؟ نہیں نہیں خالہ جان آپ کو غلط فہمی......''

''کیسی غلط فہمی بی بی۔'' وہ بات کاٹ کے بولیں۔ ''بلکہ تمہیں خوش فہمی ہے اپنے میاں کے بارے میں۔ ارے بچپن سے جانتی ہوں اسے جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا ہی زمین کے اندر۔ گھنا میسنا ہے بالکل، پھر بھی ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ پوری برادری میں چرچا ہے کہ آج کل فاروق میاں بلا ناغہ نگینہ کے گھر کے چکر لگاتے ہیں۔ اچانک ہی پھوپھی کی محبت بھی امڈی چلی آ رہی ہے، ڈاکٹر کے ہاں جانا ہو، بل جمع کرانا ہے۔ کرایہ داروں کا کوئی مسئلہ ہو۔ وکیل سے بات کرنی ہو جھٹ اس کے سکول فون کیے جاتے ہیں اور وہ خبیث بھی سارے کام چھوڑ چھاڑ ان کی سیوا میں حاضر ہو جاتا ہے۔ اچھا خاصا قصہ مشہور ہو رہا ہے خاندان بھر میں کہ مشتری بی بی اپنی اکلوتی بیوہ لڑکی کے لیے اب کسی گھر داماد کو پھانسنے کے چکر میں ہے۔ میں تو تمہیں ہوشیار کرنے آئی تھی کہ بی بھولی اپنے مرد کو نکیل ڈالو مانا کہ اس نگینہ کے پاس کوئی ایسا حسن بھی نہیں لیکن فی زمانہ پیسے کا چارہ بھی بہت ہوتا ہے کسی بھی آدمی کو دیوانہ کرنے کے لیے۔''

وہ برقع سنبھال کر چل دیں اور نورین سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ ابھی تو طبیعت پہ چھائی پژمردگی اور کوفت بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ یہ ایک نئی الجھن وہ پہلے ہی اس قدر الجھی ہوئی تھی میکے میں تین دن گزار کے۔ اتفاق سے اس کی بہن شاہین بھی ان ہی دنوں وہاں آئی ہوئی تھی اور اس کی آؤ بھگت نے نورین کو نامحسوس سی خفت میں مبتلا کر دیا تھا۔

اسے ہر پل یہ لگتا جیسے بھابھیاں اپنی دونوں نندوں کا موازنہ کر رہی ہوں اور ظاہر ہے کہ اسے اپنا پلڑ بے حد ہلکا محسوس ہوتا۔ اپنی فطرت اور خواہش کے عین خلاف، محض شوہر کے ماتھے کے بل دور کرنے اور گھ گرہستی بچانے کی خاطر باپ بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کے وہ اپنا اعتمادی کھو چکی تھی۔ اس کی شخصیت سے خود اعتمادی رخصت ہو چکی تھی۔ اب اس کی جگہ ایک کھسیانی سی مسکراہٹ، منمناتی آواز میں ضرورتیں بیان کرتی اور ممنون و مشکور نگاہوں والی عورت نے لے لی تھی۔

وہ رشک سے شاہین آپا کو بھابیوں سے چہلیں کرتے، بھائیوں کو ان کی لاپروائی پہ ٹوکتے دیکھتی رہی۔ کیسے وہ بیگ بھر کے سب کے لیے فیصل آباد سے لان کے خوبصورت سوٹ لائی تھیں۔ کتنے استحقاق سے جاتے وقت بھائی کے بچوں کو نقدی تھما کے گئی تھیں ایسی نندوں کی تو چار کڑوی باتیں بھی بھابیاں ہنس کے سہ لیتی ہیں۔ اور وہ...... وہ جتنے دن رہتی، اماں کے کمرے تک محدود رہتی۔ کوئی بھابھی اسے پاس بٹھا کے خوش گپیاں نہ لگاتی۔ کوئی شاپنگ پہ ساتھ نہ لے جانا چاہتی وہ آگے بڑھ بڑھ کے کچن کے کام کرتی کوئی تکلفاً بھی منع نہ کرتا اور مروتاً بھی شکریہ ادا نہ کرتا۔ جبکہ شاہین آپا کو کسی نے ہل کے پانی تک نہ پینے دیا تھا، اسے اپنی بے وقعتی اور کم مائیگی کا احساس پہلے سے بڑھ کے ہو رہا تھا۔ ان سب کی وجہ وہ فاروق کی حریص طبیعت

گرادانتی ہوئی سخت کبیدہ ہو رہی تھی، اب نرگس خالہ کی اطلاعات نے اسے مزید سلگا دیا اور فاروق کے آتے ہی اس سے جواب طلب کرنے کھڑی ہو گئی۔

''ہاں جاتا ہوں......تو پھر......؟'' اس کی توقع کے خلاف وہ فوراً ہی بولا تو وہ ٹھنڈی پڑ گئی، اس کا تو خیال تھا کتنا لڑ جھگڑ کے ہی وہ اس سے یہ بات اگلوا سکے گی۔

''کیا مطلب پھر......؟ آپ کا کیا کام ہے وہاں، ٹھیک ہے وہ آپ کی پھوپھی کا گھر ہے لیکن وہاں کوئی مرد نہیں رہتا اور آپ کا جانا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ پچھلے کئی سالوں سے دونوں گھرانوں کا میل جول برائے نام ہی رہ گیا تھا، پھر ایکا ایکی نگینہ کے دوبارہ آجانے کے بعد آپ کے وہاں پھیرے لگانے کا کیا مطلب نکلتا ہے؟''

''یہی ہے کہ میرا اس سے معاشقہ ہے۔ ہے نا، بے وقوف عورت میں اسے کسی قابل سمجھتا تو پہلے ہی کیوں منگنی تڑواتا۔ اکیلی عورتیں ہیں اسی لیے تو جاتا ہوں، آخر رشتہ داری ہے۔ مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔'' اس نے ٹالا۔

''آپ کے سوا بھری دنیا میں کوئی اور اپنا نہیں ان کا۔'' وہ بھری بیٹھی تھی۔

''بڑی زبان چل رہی ہے، آخر کیوں نہ چلے تین دن میکے والوں نے خوب رنگ صاف کیے ہوں گے، اچھی چابی بھری ہو گی۔ ہاں بھئی ان کے پاس اور ہے بھی کیا۔ بیٹی کو دینے کے لیے نہ تربیت. نہ نصیحت اور نہ ہی پیسے۔ بس یہ گر سکھا دیتے ہیں کہ کس طرح شوہر کے ناک میں دم کیے رکھنا ہے۔'' وہ اپنے پسندیدہ موضوع پر آ گیا وہ کڑھتی ہوئی کچن میں چلی گئی لیکن اس کے بڑبڑانے کی آوازیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ کتنی ہی دیر لیٹا بچوں سے گفتگو کے دوران اسے سنانے کو جلی کٹی باتیں کرتا رہا، جن کا مطلب وہ بخوبی سمجھتی تھی۔

چند ہی دن بعد وہ اس کے سر ہو گیا کہ وہ اپنے باپ سے پچاس ہزار روپیہ لے کے آئے تا کہ وہ محلے میں کوئی پورشن کرائے پر لے کے بڑے پیمانے پر اکیڈمی کھول سکے۔

''پچاس ہزار......آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے، وہ کیوں دیں گے اتنی بڑی رقم۔'' وہ اس کا نیا مطالبہ سن کے اچھل پڑی۔

''بڑی رقم...... یہ بڑی رقم ہے۔ پورشن کا ایڈوانس اور سکیورٹی دینے میں ہی آدھی رقم لگ جائے گی کچھ ضروری فرنیچر وہ بھی سیکنڈ ہینڈ آئے گا اور ظاہر ہے پبلسٹی پہ بھی کچھ نہ کچھ پیسے لگیں گے پمفلٹ چھپیں گے، بینر لگیں گے چوک میں۔'' اس نے خرچہ گنوایا۔

''لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟''

''تو کیا ساری عمر گھر گھر جا کے بچے پڑھاتا رہوں، یہ اکیڈمیوں والے ہزاروں روپے فیس لیتے

ہیں اور اتنا سر کھپانے والے ٹیوٹرز کو ملتا ہی کیا ہے۔ بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنی اکیڈیمی کھولوں گا۔ تم پڑھی لکھی ہو کے بھی یہ بات نہیں سمجھتیں کہ زندگی میں ہر دم آگے بڑھنے کی سوچ رکھنی چاہیے۔ تم تو کنوئیں کا مینڈک بن کے زندگی گزارنا چاہتی ہو ساتھ ہی مجھے اور بچوں کو بھی گھٹ گھٹ کر جینے کا سبق دیتی ہو۔ تم سے تو وہ میٹرک پاس نگینہ عقل مند ہے اسی نے یہ آئیڈیا دیا ہے۔"

"اوہ تو یہ خناس اس نے بھرا ہے، بھلا اسے آپ کے برے بھلے سے کیا مطلب؟"

"اسے میرا خیال ہے، اسی لئے تو اتنی فکر کرتی ہے۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے اس کے ساتھ، اسے کم صورت اور جاہل ٹھہرا کے برسوں پرانی منگینی توڑی جس کے ازالے کے لیے پھوپھا جان نے جلد بازی میں اس کی شادی ایک بیمار شخص سے کردی اس کے باوجود اتنی صاف طبیعت ہے کہ ابھی بھی میرے لیے سوفٹ کارنر رکھتی ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک پیش کش کی ہے کہ شوہر کے ترکے میں ملنے والا مکان وہ میرے لیے کرایہ داروں سے خالی کرواسکتی ہے۔"

"اوراس کے لیے اس نے شرط کیا رکھی ہے؟" دل ہی دل میں لرز جانے کے باوجود وہ کمال حوصلے سے لہجے پہ قابو پا کے سکون سے بولی تو اپنی رو میں کہنے جانے والا فاروق گڑبڑا گیا۔

"کیسی شرط......کوئی شرط نہیں۔" اس کا رنگ اڑ گیا۔" میں نے تو اس کی پیشکش شکریہ کے ساتھ لوٹا دی، یہ کہہ کر مجھے اپنے طور پر کوشش کرنے دو۔ کچھ نہ بن پایا تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔ ٹھیک کہا ناں میں نے، تم جو ہو میری مدد کے لیے تو مجھے اوروں کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے اسے موم کرنا چاہا۔

"لیکن میرا تقریباً سارا زیور تو آپ بہت پہلے بیچ چکے ہیں، اپنے کوئی پرانے قرضے اتارنے کے سلسلے میں۔ اب تو یہ گلے کی چین، کانوں کی بالیاں اور بری کا ایک ہلکا سا جڑاؤ سیٹ ہے ڈیڑھ دو تولے کا، پھر بچیوں کے ٹاپس ہیں جو پچھلی سالگرہ پہ امی نے دیے تھے۔ کل ملا کے بیس ہزار کے بھی نہ بنیں گے۔"

"اور وہ کڑے جو تمہارے بھائی نے اپنے بیٹے کی خوشی میں تمہیں چڑھائے تھے۔" اس نے کریدا۔

"آپ جانتے ہیں وہ میں نے بینک میں رکھوائے ہیں، عینی اور رانی کے لیے، ویسے بھی آپ یقین کیجیے۔ سارا زیور بیچ کے بھی پچاس ہزار نہیں بنیں گے۔"

"تو مت بیچو، ضرورت بھی کیا ہے ہاتھ، کان ننگے کرنے کی۔ اپنے ابو سے مانگو، بھائیوں سے کہو پچاس ہزار ان کے لیے کیا بڑی بات ہے اور پھر میں کونسا روز مانگنے جاتا ہوں، پہلی بار ضرورت پڑی ہے۔"

"ہونہہ، پہلی بار۔" وہ بڑبڑائی تو انتہا درجے کے سکون کے ساتھ نیم دراز فاروق پہلی بار بھڑکا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا، کیا کہنا چاہتی ہو۔ تمہارے اور بچوں کے لیے ہی مانگ رہا ہوں اپنی عیاشی کے لیے نہیں۔ مجھ سے اب بسوں ویگنوں کے دھکے کھا کے سو دوسو کی ٹیوشن پڑھانے نہیں جایا جاتا۔ سکون کی

زندگی گزارنا چاہتی ہو تو کل ہی بچے لے کے میکے چلی جاؤ۔ لڑ کے جھگڑ کے، منت کر کے کسی بھی طرح رقم لاؤ، تمہارے اپنے بھائی ہیں، کوئی غیر نہیں جو مانگتے ہوئے تمہیں اتنی تکلیف ہو رہی ہے، ان کی کمائی پہ تمہارا ابھی حق ہے بلکہ بیٹیوں کا حق ساری عمر رہتا ہے۔ اپنا حق منواؤ کسی بھی طریقے سے۔ میں ایک ہفتہ انتظار کروں گا پیسے لا سکو تو ٹھیک ہے ورنہ وہیں رہ جانا۔ مجھے دوسری جگہ سے رقم مل ہی رہی ہے پھر کیا ہوا اگر وہ چند شرطیں بھی لگا دیں گے تو۔'' اس نے کروٹ لی اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

تیاری تو وہ بھی کر رہی ہے، صبح پھر سے میکے جانے کی۔

''امی! آپ پھر سے بیگ بھر رہی ہیں۔ ہم پھر نانو گھر جائیں گے۔'' عینی نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! تم درخواست لکھ دو سکول دو دن کی چھٹی کی۔''

''نہیں امی، ہم وہاں نہیں جائیں گے، مامیاں ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہیں۔ ریموٹ اٹھاؤ تو گھورتی ہیں اس دن تو اتنی زور سے چھینا میرے ہاتھ سے ان کا لمبا ناخن مجھے چبھ گیا۔'' رانی بسوری۔

''تو بیٹا آپ کیوں کسی کی چیزیں چھیڑتی ہیں۔ کسی کے گھر جا کے آرام سے بیٹھتے ہیں۔ ادھر ادھر فضول ہاتھ نہیں مارا کرتے۔'' اس نے سمجھایا۔

''لیکن آخر ہم کیوں جاتے ہیں اتنے اتنے دن وہاں رہنے۔ اتنے دن تک کیسے کسی چیز کو ہاتھ لگائے بغیر رہ سکتے ہیں۔'' اس کی بیٹی نے نکتہ اٹھایا۔

''اور ہاتھ نہ لگائیں تب بھی ڈانٹ تو پڑتی ہی ہے۔ اس دن میں نے ناشتہ میں پراٹھا مانگا تو بڑی مامی غصے سے کہنے لگیں سوکھی روٹیاں کھانے والے یہاں آ کے کتنے چٹورے ہو جاتے ہیں۔ اتنی انسلٹ فیل ہوئی مجھے۔'' عینی اس کی طرح ضرورت سے زیادہ حساس تھی۔ وہ کٹ کے رہ گئی۔ اتنا رکیک جملہ میری اولاد کے لیے۔

''اور مانی کو تو ٹیپو اور بلو ہر وقت مارتے رہتے ہیں۔ اسے اپنے کھلونے دکھا کے چڑاتے ہیں، وہ تو بچہ ہے رو رو کے مانگنے لگتا ہے تو......تو......سب تالیاں بجاتے ہیں......اور کہتے ہیں......فقیر......فقیر آئے ہیں ہمارے گھر......'' عینی نے اٹک اٹک کے بتایا تو وہ جہاں کی تہاں رہ گئی پھر کچھ سوچ کے مسکرائی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا! مارتے ہیں تو مار کھا لیا کرو۔ فقیر کہتے ہیں تو سن لیا کرو......انسلٹ کرتے ہیں تو......سہہ لیا کرو......اچھا ہے نا عادت پڑ جائے گی۔ بڑی ہو کے تمہیں یہ سب اتنا مشکل نہیں لگے گا جتنا مجھے لگ رہا ہے۔'' اس نے بیٹی کے آنسو صاف کیے۔

☆

اور یہ کہانی تو پھاتاں اور نورین جیسی ہو ہی نہیں سکتی کبھی بھی نہیں۔ کہاں پھاتاں جیسی گھر گھر کام

کرنے والی نچلے درجے کی عورت، کہاں نورین جیسی خوداعتمادی سے محروم شوہر کی مرضی اور خواہش کو حرفِ اول جاننے والی متوسط طبقے کی عام سی عورت اور کہاں مسز مریم ٹوانہ جیسی گریس فل، خوبصورت، بارعب ہائی سوسائٹی کی جانی پہچانی شخصیت رکھنے والی خاتون، جی ہاں یہ کہانی ہے مشہور سوشل ورکر مسز مریم ٹوانہ کی۔ سلک اور شیفون کی مہین ساڑھیاں پہنے، اونچی ہیل والی جوتی کے ساتھ بے دھڑک قدم اٹھاتی، لانبی دودھیا گردن کو مزید اونچا کیے۔ گندمی سنہری رنگت پہ کھل جانے والا تیز رنگ کا میک اپ کیے وہ کہیں سے بھی ایک جوان ہوتے بیٹے کی ماں نہ لگتیں۔

اگرچہ سبکتگین ٹوانہ بزنس ٹائیکون سمجھے جاتے ہیں، خاندانی حوالہ بھی کم پُرکشش نہیں اس کے باوجود مسز مریم ٹوانہ کی اپنی ایک منفرد اور مضبوط سماجی حیثیت ہے۔ وہ بھی کسی گرے پڑے خاندان کی تو ہیں نہیں البتہ ان کے سسرال کو سیاست کی وجہ سے ذرا زیادہ شہرت مل چکی تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح جان گئی تھیں کہ بے تحاشا دولت سے زیادہ شہرت آپ کو زیادہ اہم بناتی ہے اس لیے انہوں نے ہر اس جگہ ہاتھ پیر مارے جہاں جہاں سے شہرت ملنے کی توقع تھی۔ انڈسٹریل ہوم، این جی او سے لے کر لیڈیز کلب اور ہیلتھ سنٹر تک قائم کیے۔ آئے دن اخبار کے فرنٹ پیج پہ نہ سہی اندرونی صفحات پہ کسی نہ کسی پارلر، بوتیک کا افتتاح کرتے ہوئے یا حقوقِ نسواں کے کسی شو میں شرکت کرتے ہوئے ان کی تصویریں چھپی ہوتیں۔ فارغ عورتوں کی طرح انہوں نے بچے پہ بچہ پیدا کر کے اپنا غصہ نہیں نکالا تھا، ان کا ایک ہی بیٹا تھا سکندر ٹوانہ، جو اپنی سکولنگ مکمل کرنے کے بعد آج کل گھر پہ پایا جاتا تھا وہ دونوں طے نہیں کر پا رہے تھے کہ اسے اسٹیٹس بھیجا جائے یا آکسفورڈ......اس فکر سے قطع نظر ایک اور الجھن نے بھی مریم ٹوانہ کو گھیر رکھا تھا۔

سکندر کے ساتھ ان کا تعلق بے شک اتنا ہی تھا جتنا کہ اس سوسائٹی کی کسی بھی ایکٹو کیریئر وومن کا اپنی اولاد سے ہوسکتا ہے لیکن گورنس کے حوالے کر دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی غافل ہوگئی ہوں۔ نجانے کیوں لوگ ان بیگمات کے بارے میں ایسے غلط تصورات رکھتے ہیں، بچوں کے لیے راتوں کو جاگنا، نیپی بدلنا، فیڈر بنانا، لوری سنانا، تھپک کے سلانا، ہوم ورک کرانا، پوئمز رٹانا، یہ سب دقت طلب اور مشکل ترین کام یقیناً مصروفیت اور سہل پسندی کی وجہ سے وہ نہیں کر پاتیں لیکن ایسا نہیں کہ اپنی اولاد سے محبت ہی نہیں کرتیں فکرمند نہیں ہوتیں۔

بھلا محبت کرنے میں کونسے ہل جوتنے پڑتے ہیں اور فکر و ٹینشن سر پر سوار رکھنا تو ان بیگمات کی ہابی ہے۔ اس لیے مسز مریم ٹوانہ نہ صرف سکندر سے محبت کرتی تھیں بلکہ اب جب کہ پچھلے دو تین ہفتوں سے وہ مسلسل گھر پہ اتنا وقت گزار رہا تھا وہ ایک نئی فکر میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ شروع ہی سے سکندر کا رجحان غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف کم ہی تھا۔ سبکتگین اپنے دوستوں اور مریم اپنے سرکل کی لیڈیز سے آئے دن ان کے ٹین ایج

بچوں کے مختلف پرابلمز سنا کرتے۔ کسی کی بیٹی نیٹ چیٹنگ کے ذریعے ایک فراڈ کے ہاتھوں ٹریپ ہو گئی، کسی کا بیٹا اپنے مڈل کلاس دوست کی مہربانی سے اس گندے بازار کا راستہ دیکھ آیا کسی کی پندرہ سالہ بے بی سموکنگ کرنے لگی تو کسی کا چودہ سالہ بابا کوکین کی لت کا شکار ہو گیا۔ لیکن سکندر نے اب تک اپنے پیرنٹس کو کسی ناخوشگوار جھٹکے سے...... محفوظ رکھا تھا، سکول کے بعد ٹیوشن دو گھنٹے لیتا اس کے بعد وہ جم خانہ چلا جاتا۔ اکثر باپ کی ملاقات وہیں اپنے بیٹے سے ہوتی، کبھی ٹینس کورٹ میں، کبھی سنوکر ٹیبل پہ اور کبھی سوئمنگ کرتے ہوئے۔

وہ اس کی ایکٹیویٹیز سے مطمئن تھے لیکن اب مریم اسے دن کا بیشتر حصہ گھر میں گزارتے دیکھ کر بے چین ہو جاتی، شام کو وہ جم خانہ اب بھی باقاعدگی سے جاتا، ہفتے میں ایک دو بار فرینڈز کے ساتھ آؤٹنگ پہ بھی چلا جاتا لیکن باقی وقت لاؤنج میں صوفے پہ نیم دراز چینل سرچنگ میں گزارتا۔ دن کو گیارہ بارہ بجے جب مسز ٹوانہ اپنی سیلولیس مہین سی نائٹی میں ملبوس، چہرے پہ ماسک لگائے بیڈ روم سے برآمد ہوتیں اور چلا کر ڈرائیور کو آج کے شیڈول یاد کراتیں۔ وہ ناگواری سے ان کے حلیے کو دیکھتا۔

''ماما پلیز...... فار گاڈ سکی یوں نوکروں کے سامنے...... پلیز اندر جائیے۔'' اسے مسٹنڈے ڈرائیور کے سامنے ماما کا یوں کیئر فری ہو کے نکلنا پسند نہ آتا، جبکہ وہ شاید یہ سمجھتی تھیں کہ یہ شوفر، بٹلر، مالی...... یہ سب پتلے ہیں۔ ان میں وہ مخصوص مردانہ حس تو ہے نہیں۔ یہ سب تو جیسے ان کے زرخرید غلام تھے۔ لیکن سکندر کو نجانے اتنی سی عمر میں بھی اس کے پیٹ کی بھوک آنکھوں تک آتی نظر آ جاتی۔ شام کو جب وہ اپنے معمول کے دورے پہ نکلتیں، وہ عموماً گھر پر نہیں ہوتا تھا لیکن واپسی پہ وہ گڑبڑا جاتیں جب اسے آدھی رات تک لاؤنج میں بیٹھا پاتیں، وہ کہتا کچھ نہیں تھا صرف ایک نظر ڈالتا تھا اور منہ پھیر لیتا تھا اور مسز مریم کو یوں لگتا جیسے اس ایک نظر نے ان کے گداز دودھ سے عریاں شانے اور بازو، مرمریں گردن سے کہیں نیچے تک عیاں ہوتے ابھار، پھنسے ہوئے مختصر بلاؤز کے نیچے اور سٹائل سے باندھی گئی ساڑھی سے اوپر لشکارے مارتی لچک دار کمر...... سب کو تھوک سے لتھڑ دیا ہو، وہ ساڑھی کے پلو سے جوان بیٹے کی نظروں سے بدن چرائے آگے بڑھتیں۔

''سنی ڈارلنگ! مائی چائلڈ...... ابھی تک جاگ رہے ہو؟''

بدبو کا ایک بھبکا سا ان کے منہ سے نکلتا، ان کا ڈارلنگ چائلڈ کراہیت بھرے تاثرات کے ساتھ بدک کے پیچھے ہٹتا اور دھڑ سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتا۔ اس کا یہ خاموش گریز چند ہی دن میں مریم ٹوانہ کو جھنجلاہٹ کی انتہا تک لے آیا۔ سبکتگین سے بات کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ مریم کی فیلنگز کبھی نہ سمجھ پاتا۔ جان ہی نہیں پاتا کہ اتنی مضبوط اور کانفیڈنٹ عورت ایک بچے سے خائف ہے۔ کیسے سمجھاتیں وہ اسے کہ ایک ناں جوان ہوتے بیٹے سے خائف ہے۔

''اور اس ساری سچویشن کے ذمہ دار بھی تم ہی تو ہو سبکتگین!'' انہوں نے سوچا اور بے چینی سے سکندر

کا ایڈمیشن جلد از جلد ہو جانے کا انتظار کرنے لگیں۔

آج انہیں ایک گرلز کالج میں ہونے والے تقریری مقابلے میں جج کے فرائض ادا کرنے تھے۔ ''خواتین اور معاشرے میں ان کا مقام۔'' جیسا سدا بہار موضوع تھا۔ وہ غیر حاضر دماغی سے لڑکیوں کے زور شور سے ہونے والے مباحثے سنتی رہیں ساری توجہ اس تقریر کی طرف تھی جس کے رٹے کل سے لگا رہی تھیں۔ بڑے جوش سے وہ ڈائس پر آئیں۔

''آپ سب نے معاشرے میں عورتوں کے مقام کو اجاگر کرنے کے لیے کتنے دلائل دیے۔ کبھی ماں کے حوالے سے کبھی بیٹی کی حیثیت سے، بیوی کی روپ میں، بہن کی حیثیت سے لیکن میں پوچھتی ہوں کہ عورت بحیثیت ایک عورت اپنا مقام کب پائے گی۔ کیا ماں، بیٹی، بہن، بیوی اور محبوبہ، ان رشتوں کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں......

اسے رشتے کے لیبل کے بغیر کیا کوئی عزت نہیں مل سکتی، کیا یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کی بہن ہو، بیوی ہو یا بیٹی ہو تب ہی کوئی مرد اس کی اہمیت تسلیم کرے گا۔ اپنی طاقت کو عورت خود تسلیم کرواسکتی ہے اگر چاہے۔ یہ تب ہوسکتا ہے جب وہ اتنے بہروپ بدلنے کے بجائے صرف ایک مضبوط عورت کے روپ میں ابھرنا پسند کرے۔ میں یہ نہیں کہتی عوت کسی کی بیوی نہ بنے، ماں نہ بنے، ضرور بنے لیکن اپنی شناخت قائم رکھے۔ بیوی بن کر صرف شوہر کے لیے اپنی ہستی مٹا ڈالنا خود اپنے ساتھ ناانصافی ہے۔ خدا نے ایک الگ وجود کے ساتھ آپ کو پیدا کیا ہے، اسے شوہر کی پسند ناپسند کے سانچے میں ڈھالنا اپنی ذاتی شخصیت کے ساتھ ظلم ہے۔ باپ اس کے لیے جو رستہ پسند کرتا ہے وہ بیٹی ہونے کے ناتے چپ چاپ سر جھکا دیتی ہے۔ شوہر کو جو عادتیں ناپسند ہوں بغیر کسی مزاحمت کے ترک کر دیتی ہے جس روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ دھار لیتی ہے، حتیٰ کہ اس کا بیٹا...... اس کا اپنا بیٹا جسے اس نے خود جنم دیا ہوتا ہے وہ بھی اسے اپنی پسند کے سانچے میں ڈھلا دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک آئیڈیل ماں کے روپ میں...... کس قدر افسوس کا مقام ہے وہ صرف اس لئے ان تمام رشتوں کے ہاتھوں مہرہ بنی رہتی ہے کہ اسے ان سے محبت ہے۔ وہ کمزور نہیں...... لیکن کمزور پڑ جاتی ہے، کیونکہ وہ یہ سہارے کھونا نہیں چاہتی۔ اپنا سہارا آپ بنیے۔ ایک مضبوط خودمختار اور خوددار عورت۔''

تالیوں کی گونج میں انہوں نے اپنا موقف بیان کیا۔ تحسین و داد کا نشہ گھنٹوں ان کے حواسوں پہ چھایا رہا تاوقتیکہ رات کو سبکتگین اس سے باز پرس کرنے کھڑا ہو گیا۔

''کر دیا نا میرا کباڑا...... میں تو رات ہی کہہ رہا تھا یہ ملنگنیوں والا حلیہ بنا کے پارٹی میں جانے کیا ضرورت ہے، پھر تمہاری خاموشی سے یہ سمجھا کہ شاید یہ بھی کوئی ٹرینڈ ہو۔ ڈھیلا ڈھالا سا چغہ نما ڈریس لیکن وہاں ہمدانی کی تیسری بیوی کو کیٹ ونسلیٹ والا گاؤن پہنے دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا یہ ڈیل میرے ہاتھ سے نکلی اور

یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' نرم و شائستہ سے انداز میں بولنے والے سبکتگین کا یہ روپ صرف مریم کے سامنے عیاں ہوتا تھا اور وہ بھی کبھی کبھار۔

''ہوا کیا ہے؟'' وہ جانتی تھیں کوئی مالی دھچکا ہی لگا ہوگا کہ ان کے شریکِ حیات کی خوشی، دکھ، غصہ سب اسی سے وابستہ تھیں۔

''ہونا کیا ہے، میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ اس پارٹی میں سب ہی ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے نئے کانٹریکٹ کے لیے خصوصاً ہمدانی اور ظفر...... ظفر سے تو مجھے خاص خطرہ تھا اس نے ابھی پچھلے ماہ کراچی کی ٹاپ ماڈل سے شادی کی ہے اور ہمدانی کی تیسری بیوی کے ہتھیاروں سے کون نہیں واقف پھر بھی تمہاری صلاحیتوں پہ اعتماد کرتے ہوئے میں نے تمہیں گائیڈ لائن نہ دی۔ ویسے بھی اتنے سالوں میں اب تمہیں خود Prepare ہونا چاہیے۔ لیکن تم نے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ملّانی بن کے چلی گئیں۔ یہ نئے تجربے اپنی کئی پارٹیز تک محدود رکھا کرو۔ میرے سرکل میں موو کرنے کے لیے وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔''

''او گاڈ سبکتگین! تم کب اپنے پیروں پہ کھڑے ہوگے۔ یہ سارا بزنس پیسہ جس پہ اتراتے پھر رہے ہو، اپنے بل بوتے پہ کیوں نہیں کماتے۔ کب تک بیوی کو سجا بنا کے دوسروں کے آگے بطورِ رشوت پیش کر کے کانٹریکٹ حاصل کرتے رہو گے۔'' صبح کی گئی تازہ تازہ تقریر کا اثر سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ ایک مضبوط، خودمختار...... خوددار عورت......

''واٹ ربش......! میں تمہارے کاندھوں پہ سوار ہو کے یہ سارا بزنس ایمپائر چلا رہا ہوں، میرا بزنس سینس، بریلینٹ مائنڈ یہ سب کچھ بھی نہیں۔ ارے میں تو مٹی میں ہاتھ ڈالوں تو وہ سونا بن جائے۔ لائف پارٹنر ہونے کی حیثیت سے اگر تم میرے کسی کلائنٹ کو ڈیل کر لو گی تو کیا میری ترقی میں حصہ دار بن جاؤ گی، یہ کام تو چند ہزار دے کے کسی پروفیشنل سے بھی کرایا جا سکتا ہے۔'' اس کی اس حد تک گری بات پہ وہ سن ہو کر رہ گئی۔

''لیکن میں اتنے گند میں اتر کے کام کرنے کا عادی نہیں۔ میں نے تم سے آج تک کوئی غلط کام نہیں کروایا۔ بس یوں سمجھو تو میرے لیے ایک پی آر او کا کام کرتی ہو اور کوئی نرالی بات نہیں۔ یہاں یہی سب چلتا ہے۔''

''میں نے کب تمہارے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ موٹی موٹی توندوں والے پارسی سیٹھوں کے حسن و وجاہت میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ فارن سے آنے والی ڈیلی گشنز کے لیے ایسٹرین اسٹائل پارٹنر کا اہتمام کیا ہے کلاسیکل ڈانس اور قوالی کی محفلوں کے ساتھ اور وہ تمہارے چغتائی صاحب...... وہ تو میرے زورِ بیان اور حسنِ گفتگو کے عاشق ہیں، کل بھی میں نے تو انہیں اپنی طرف سے باتوں کے جنگل میں بھگانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔''

''ہونہہ...... باتیں......صرف باتیں......خوش فہمی ہے تمہاری کہ تم صرف ذہن اور گفتگو کے بدلے کسی کو تسخیر کر سکتی ہو۔ گھر کے اندر بیٹھی عورت صبر، محنت اور خدمت سے بازی جیتتی ہے جب کہ باہر نکلنے والی عورت کے پاس واحد ہتھیار ناز و ادا اور حسن ہوتا ہے۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن کل کی بازی ہمدانی کی وہ تیسری نئی نویلی بیوی جیت چکی ہے جس سے شادی کرنے پر تم نے سرِ عام ہمدانی پہ ہوٹنگ کی تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ دینے کے لیے لباس کے ساتھ ساتھ لائف پارٹنر میں چینجنگ ضروری ہے۔''

اس کی دھمکی شاید مریم ٹوانہ کی سمجھ میں نہ آئی اسی طرح اپنی بات پہ ڈٹی رہی۔

''یس ڈارلنگ! بدلتے وقت کا تقاضا......اب میری عمر......آئی مین......'' عمر کے بارے میں حد درجہ حساس مریم کھلے دل سے اعتراف نہ کر سکی کہ تیس بتیس سے اوپر نہ لگنے کے باوجود وہ ہے تو ایک کم چالیس کی۔

''سنی کی عمر بھی تو دیکھیں، اب وہ بڑا ہو رہا ہے۔ مجھے اس کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔ لاسٹ ویک جم خانہ میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تھا جب میں کھوکھر صاحب کے ساتھ وہاں گئی تھی اور وہ جس کاک ٹیل پارٹی میں آپ نے مجھے اکیلے بھیجا تھا۔ یاد ہے، میں نے بتایا تھا کہ سکندر بھی وہاں موجود تھا اس کے کسی فرینڈ کے فادر نے وہ پارٹی ارینج کی تھی۔ اس قسم کی پارٹیز میں بغیر آپ کے...... میری موجودگی اس کا موڈ آف کر گئی۔ میں نے بھی بہت آکورڈ فیل کیا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ماں کی حیثیت سے میں اس سے باز پرس کرتی کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے لیکن برعکس اس کے میں خود بیٹے سے آنکھیں چراتی پھر رہی تھیں۔ دکھ تو مجھے اس بات کا تھا اس نے کسی پہ ظاہر تک نہ کیا کہ میں اس کی ماما ہوں، اس کے فرینڈز دوسری عورتوں کے ساتھ مجھ پہ بھی ریمارکس دے رہے ہوں گے۔ اس نے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ میں ماں ہوں سبکتگین! مجھے بیٹے کا بھی تو سوچنا ہے اس کی فیلنگز ہرٹ نہ ہوں۔ یہ خیال بھی تو رکھنا ہے۔''

رفتہ رفتہ صبح کی گئی تقریر کے تمام دلائل مریم کے ذہن سے محو ہو گئے، سبکتگین سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے ڈین۔ تمہیں نیا نیا ماں بننے کا شوق چرایا ہے۔ یا تم میرا ساتھ دینے سے کترانے کے لیے یہ ڈرامے کر رہی ہو۔ جو بھی ہے تمہیں اتنا بتا دوں کہ مریم، سبکتگین ٹوانہ کی وجہ سے ہے۔ وہ مریم کی وجہ سے نہیں۔ تم نہیں تو کوئی اور مہرہ آگے لے آؤں گا۔ ہمدانی بھی تو نقصان میں نہیں رہا اور وہ ظفر اس کرسچین ماڈل سے شادی کرنے کے بعد تو اس کے حالات ہی بدل گئے ہیں تم گھر سنبھالو اور بیٹا...... شاید تم اسی قابل تھیں۔ تمہاری صلاحیتوں کی زیادہ ضرورت اب اس گھر کو ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟'' اس کا لہجہ اندازِ تخاطب سب بدل گیا۔ استفسار کی بجائے سوال میں بے چارگی اور دہائی زیادہ تھی۔

''میں آپ سے اپنا پرابلم ڈسکس کر رہی تھی اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ یہ......سکندر...... دراصل بہت......شاید اس کی کمپنی اچھی نہیں۔ عجیب فرسودہ سی مڈل کلاس ذہنیت ہوگئی ہے۔ جتنا جلدی ہو سکے اسے اسٹیٹس بھجوائیں۔'' چور نگاہوں سے اس کے تاثرات جانچتی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو کر موئسچرائزر چہرے اور گردن پہ ملنے لگی۔ سبکتگین کچھ نہ بولا لیکن وارننگ دیتی نگاہوں اور وکٹری کا نشان دکھاتی مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

مریم ٹوانہ تھکے تھکے انداز میں اسٹول پہ بیٹھ گئیں۔ ایک اکتا دینے والی نظر سے ڈریسنگ پہ یہاں سے وہاں تک سجے کلونز لوشنز، کریمز اور میک اپ کے دوسرے لوازمات کو دیکھا۔ اب سائیڈ پہ پڑے موبائل کو اٹھا کر چند نمبر پش کیے۔

''ہیلو......نغمہ......'' دوسری طرف ان کی سیکرٹری تھی۔

''ہاں کوئی خاص بات نہیں...... میں صبح این جی او کی میٹنگ میں نہیں آسکتی۔''

''نہیں......کوئی کام نہیں......اوہو......کہا ناں......اب پارلر جانے سے زیادہ ضروری تو نہیں فضول میٹنگز۔''

''اور کیا؟ مجھے کیا ملنا ہے ان بے کار کے جھنجھٹوں سے، نری دردسری......''

''بھاڑ میں جائیں عورتیں اور ان کے حقوق، فضول سی میٹنگز میں تقریریں جھاڑ جھاڑ کر ساری فریش نیس کا ناس ہو جاتا ہے۔ ٹینشن الگ......''

''اور ہاں میں تو پارلر میں تین چار گھنٹے گزاروں گی۔ تم صبح میرے ٹیلر کی طرف چلی جانا۔ تین سوٹ کل اور چار سوٹ ایک ساڑھی پرسوں دے کر آئی تھی۔ سست تو وہ ہے ہی، ابھی کہاں سینا شروع کیے ہوں گے۔ ان میں کچھ تبدیلی کروانی تھی۔''

''ہاں ہاں ذرا ماڈ لک دے دینا، پتا نہیں اس دن کس احمق نے بتایا تھا کہ لوز شرٹس اور فل سلیوز کا فیشن پھر سے لوٹ آیا ہے۔''

''کیا......؟ واقعی......؟ ہوتا رہے جب مجھے نہیں پسند یہ ڈھیلے چغے تو میں کیا کروں، تم سب شرٹس ٹائٹ رکھوا دو نیٹ کی دونوں شرٹس کے نیچے لائننگ بہت باریک لگوانا اور سلیولیس رکھنا۔ گلے بھی ڈیپ ہوں۔ ہاں آگے پیچھے دنوں طرف سے ......اور ساڑھی کا بلاؤز اسے کہنا وہ جو اس کی شاپ پہ مادھوری کی تصویر ہے...... بالکل ویسا ہی بلاؤز رکھ دے۔''

......✻......

کتنی صدیاں بندھیں

''کاشی......او کاشی......!'' ابھی اسے کھیلنے میں مزہ ہی آنے لگا تھا کہ کوثر کی آواز سنائی دی۔

''کیا ہے امی؟'' اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے منہ اوپر کر کے جواب دیا۔

''تیرے ابے کے آنے کا ٹیم ہو گیا ہے۔ چل واپس آ۔'' اس نے چھت کی ٹوٹی منڈیر سے جھانک کر تاکید کی۔ وہ گھر سے چند قدم آگے کچی گلی کے بیچوں بیچ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بیٹھا کینچے کھیل رہا تھا۔

''سنا نہیں! کانوں میں روئی دی ہوئی ہے کیا؟ جلدی آ...... منہ ہاتھ دھو کے صاف کپڑے پہن لے، ابھی تک اسکولے (سکول) والی وردی میں پھر رہا ہے۔''

کوثر نے بھی صرف ایک بار آواز دینے پر اکتفا نہ کیا۔ آخر اس کے مسلسل واویلا پہ کاشف جھنجلا کے اٹھا۔ غصے کے اظہار کے طور پر اس نے چپل سے بے نیاز پیروں کو زور سے کیچڑ میں مار کر اور بھی غلیظ کیا۔ میلے کف سے بہتی ہوئی ناک کو رگڑ کے صاف کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور لکڑی کے رنگ اُڑے کواڑ دھکیل کے اپنے گھر کی تاریک متعفن ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ روشنی سے ایک دم اندھیرے میں آ جانے سے کتنی ہی دیر آنکھیں چندھی کیے کھڑا رہا۔

''وے کاشی......!'' اوپر سے کوثر اب تک اسے آوازیں دے رہی تھی۔

''آ گیا ہوں۔'' وہ ایسے چلایا جیسے آ کر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔ اب آنکھیں گھر کی نیم تاریکی سے ذرا مانوس ہو رہی تھیں۔ صرف چار فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی۔ اس لال اینٹوں والے فرش کی ڈیوڑھی میں سے گزر کے جانا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ صرف وہی باآسانی گزر سکتے تھے جو اس سے آنے جانے کے عادی ہوں۔ ورنہ اور کوئی ہو تو اس کا تو حشر ہی خراب ہو جائے۔ اس قدر بدبو سے...... دروازے کے بالکل ساتھ جس اونچے سے ڈربے پہ بدرنگ پردہ لٹک رہا تھا، وہ اس گھر کا واحد ''باتھ روم'' تھا جہاں باتھ...... یعنی غسل کرنے والا صاف تو کیا ہوتا، الٹا ناپاک ہو کر ہی نکلتا۔ ذرا سی جگہ میں نلکا، نلکے کے نیچے

ہوئی غلیظ پلاسٹک کی بالٹی اور اس میں تیرتا تانبے کا ٹیڑھا میڑھا ڈبہ...... چھت پہ ٹین کی چادر، دیواروں میں جابجا اینٹیں اکڑھی ہوئیں اور ان کو بھرنے کے لیے یا بے پردگی سے بچنے کے لئے پرانے کپڑے گول مول کر کے ٹھونسے گئے تھے جو بدبو چھوڑ رہے تھے۔ ہر طرح کے کیڑے مکوڑے نالی کے راستے یہاں باآسانی پائے جاتے تھے۔ یہاں سے نکلنے والی نالی ڈیوڑھی سے ہوتی ہوئی گلی میں جاتی تھی اور یہی اس جگہ کی بدبو کا راز تھا اور جو رہی سہی کسر تھی وہ یہاں رکھے کوڑے کے ڈھیرے سے پوری ہو جاتی تھی۔ کوثر گھر گھر صفائی کا کام کرتی تھی، واپسی پہ بچا کھچا کھانا لے آتی، گرمیوں کے موسم میں اکثر راستے میں ہی یہ کھانا خراب ہو جاتا جو کھانے کے قابل نکلتا کھالیا جاتا، باقی اسی ڈھیر کی زینت بنتا۔ پہلے سے گلے سڑے پھلوں کے مزید گلے ہوئے چھلکے، بوٹیاں، بچی ہوئی ہڈیاں ......وغیرہ وغیرہ......

اپنے ماں باپ اور بہنوں کی طرح کاشف بھی اس بدبودار ماحول کا عادی تھا، مگر ہمیشہ کی طرح باہر سے آنے پہ آج بھی اسے بدبو کا احساس ہوا جو تھوڑی دیر تک تو رہنا ہی تھا رفتہ رفتہ اس کا احساس کم ہوتا جاتا۔ وہ اپنے کچے صحن میں بچھی بان کی چارپائی پہ آ بیٹھا۔ اس صحن میں دو ہی چارپائیوں کی گنجائش تھی۔ اس صحن میں رکھی بانس کی سیڑھی اوپر جاتی تھی۔ گھر کے واحد کمرے کے اوپر کی جگہ چھت کا کام دیتی جہاں کوثر فارغ وقت میں پائی جاتی، اس وقت بھی وہ سبزی کی ٹوکری اٹھائے نیچے اتر رہی تھی۔

''کیا پک رہا ہے۔'' اس نے چھلکوں کا ڈھیر دیکھ کر پوچھا۔

''ٹینڈے...... یہ پھلیاں تو ملکانی جی کی ہیں، چھیلنے کے واسطے لائی تھی۔ نی کڑیو! تم بھی ذرا ہاتھ ہلا لیا کرو۔ میں باہر کے بھی سیاپے کروں، گھر کے بھی نمٹاؤں۔ یہ ذرا سی رہ گئی ہیں، دونوں مل کے منٹوں میں بنالو۔''

''فیدہ......؟'' سب سے بڑی پندرہ سالہ تنک مزاج اور تیکھے نقش والی مروفاں نے اپنی کوکے والی ناک چڑھا کر کہا۔

''ایک کلو پھلیاں بنانے میں بیس پچیس منٹ لگتے ہیں اور ایک کلو کی بنوائی یہ مالکن بس دو روپے دیتی ہے۔ کیا فیدہ! دو گھنٹے لگا کے دس روپے بھی نہ ہاتھ لگیں۔ پتا نہیں تو کیا کیا کام پکڑ لاتی ہے، کبھی گٹھڑ ساگ کا، کبھی بھرے چنے نکالنے واسطے۔ کبھی لہسن چھیلنے واسطے تو کبھی پھلیاں۔ اتنا شوق ہے ان لوگوں کو مشکل مشکل مہنگی سبزیاں کھانے کا تو آپ بنالیا کریں۔ بڑا احسان کرتی ہیں کلو کے پیچھے دو روپے دے کے۔''

''تیرے لیے دس روپے کوئی چیز نہیں ہوں گے۔ گھر بیٹھی ہے نا اور وہ بھی ماں پیو کے گھر۔ میرے سے پوچھ، دس روپے میں آدھا کلو دودھ آجاتا ہے سارے دن کی چائے کے لیے، دس روپے میں پاؤ بھر دال آجاتی ہے۔ ایک وقت پکانے کے لئے اور دس روپے میں......''

''ہاں ہاں، بڑا کچھ آجاتا ہے دس روپے میں۔'' مروفاں نے ہاتھ ہلا کر کہا اور صحن میں رکھے چولہے

کو جلانے لگی۔

''دس روپے میں تین کیلے آجاتے ہیں جو آدھے آدھے کاٹ کے ہمارا سارا ٹبر کھاتا ہے۔ دس روپے میں ابا کے سگریٹ کی آدھی ڈبی آجاتی ہے جو اس نے سارے دن میں لازمی پھونکنی ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے بھئی اماں! کما دس روپے۔'' وہ زور زور سے سلور کی پرات میں حساب سے نکالا آٹا گوندھنے لگی۔ ٹینڈے کا شوربے والا سالن وہ پہلے ہی چڑھا چکی تھی۔ بہن کے دل جلے تبصروں پہ ہمیشہ کی طرح کاشف دانت نکال رہا تھا۔

''دے بیڑہ غرق...... کیسا مٹی میں رُل کے آرہا ہے۔ دفع ہو، جا کے منہ ہاتھ دھو۔ پیو آنے والا ہے۔'' کوثر کا دھیان پھر اس کی جانب گیا۔

''ہاں ہاں، جا منہ دھو۔ ابا آنے والا ہے۔ اس نے آتے ہی تیرا منہ چومنا چاٹنا ہے۔''

مروفاں نے پھر سے زہر اگلا۔ کاشف کے لب عادتاً پھیلے مگر ساتھ ہی سکڑ بھی گئے۔ اس کا چہرہ اتر سا گیا اور وہ ڈھیلے قدموں کے ساتھ منہ دھونے چل پڑا۔

اور یہ سچ بھی تھا کہ بالے نے تین بیٹیوں کے بعد منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والے اکلوتے بیٹے کو کبھی بانہوں میں بھر کر پیار نہ کیا تھا، کبھی اس کا ماتھا چوم کے لاڈ نہ کیا تھا۔ جب کہ بہت چھوٹا ہوگا تب شاید کبھی گود میں اٹھا کے پھرا ہوا۔ کاشف کو تو ایسا کوئی واقعہ یاد نہ تھا۔ ایسا نہ تھا کہ وہ بیٹے کی جانب سے لاپروا تھا یا کبھی اس کی جانب نظر نہ اٹھا کے دیکھتا تھا۔ دیکھتا تھا، گھر آتے ہی دیکھتا تھا مگر کھا جانے والی نظروں سے۔ پوچھتا تھا مگر مارنے کے بہانے کسی کام کی خاطر۔

اسی لیے اس کے آنے سے پہلے کوثر اسے نہلا دھلا، صاف کپڑے پہنا کر، گڈا سا بنا کے چارپائی پہ کتابیں دے کر بٹھا دیتی، مگر اقبال دین عرف بالے کو کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا اس کی کھنچائی کرنے کا۔

لال صابن سے رگڑ کے منہ دھونے کے بعد وہ تختی لے کر لکھنے بیٹھ گیا۔

''مانو نے آج فیر تیری گاچی کھائی تھی۔'' اس کی تختی دیکھ کے منجھلی والی رانی کو سب سے چھوٹی کی حرکت یاد آئی تو اس نے شکایت لگانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مانو کو مٹی کھانے کی عادت تھی۔ کبھی کبھی وہ کاشف کی تختی پر پھیرنے والی ''گاچی'' بھی ہضم کر جاتی۔

''ماں...... مانو نے میری گاچی کھائی ہے۔ ابھی پرسوں ہی ڈھیلا لیا تھا۔'' وہ چلایا اور کوثر نے نزدیک رکھی جھاڑو اٹھائی اور دھڑا دھڑ مانو پہ برسانی شروع کر دی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جسے جھاڑو سے مار پڑے وہ تنکے کی طرح سوکھنا شروع ہو جاتا ہے، اس لیے ہر بار ہی مانو کی پٹائی کرنے کے لیے وہ بڑے اہتمام سے جھاڑو اٹھاتی تھی تا کہ اسی بہانے مٹی، ریت اور گارا کھا کھا کے پلنے والی، موٹی کپا اس کی گیارہ سالہ تیسرے نمبر کی لڑکی کچھ دبلی ہو جائے مگر جس طرح مٹی اور گاچی اسے وٹامن اور کیلشیم کی طرح لگتے تھے، اسی طرح جھاڑو

بھی شاید کسی ٹانک کا کام دیتا تھا۔ وہ اور بھی پھولتی جا رہی تھی۔ البتہ تیرہ سالہ کالی کلوٹی بھینگی آنکھوں والی رانی کے چہرے پہ اطمینان بھری مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔ اپنی شکایت کے اس بھرپور اور تسلی بخش ردعمل پہ۔

''اماں! بتی جلا دے، اندھیرا ہو گیا ہے۔'' کاشف نے اس مار کٹائی کے عمل میں دخل دیا۔ گرمیوں میں سات بجے تک اس گھر میں بتی نہیں جلتی تھی۔ حالانکہ وہ کمرہ جو اچھی بھلی کوٹھڑی تھا، وہاں دن کو بھی بغیر بتی جلائے کچھ نظر نہ آتا تھا، اسی لیے یہ واحد کوٹھری کم ہی استعمال میں آتی۔ سارا دن اس مختصر سے صحن میں گزر جاتا، جہاں قدرتی روشنی سے تب تک کام چلانے کی کوشش کی جاتی، جب تک رات کے اندھیرے گھرے نہ ہو جاتے۔

''ابھی مغرب نہیں ہوئی، تیرا ابو آ گیا تو میری ماں بہن ایک کر دے گا کہ بجلی ضائع کر رہی ہوں۔''

''تو ادھر آ کے تختی لکھ لے کاشی! ادھر چولہے کے بالن کی بڑی روشنی ہے۔'' مروفاں نے اسے اپنے نزدیک بلایا۔

''ناں...... میں نئیں آتا، ہانڈی پکنے کی بو بڑی زہر لگتی ہے مجھے۔'' اس نے ناک پہ ہاتھ رکھا۔

''لے......تو، تو دو جے جی سے ہونے والی زنانیوں کی طرح نخرے دکھا رہا ہے۔''

کوثر نے ٹھٹھا مار کے ایک بے جھجک مذاق کیا، جس میں اس کے قہقہے کا ساتھ اس کی کم عمر کنواری بیٹیاں بڑی بے باکی سے دے رہی تھیں۔

منہ پھلا کے بیٹھے کاشف کی نظر یونہی دروازے کی جانب چلی گئی۔ لکڑی کے کواڑ میں بے شمار درزیں اور سوراخ تھے۔ جن سے باہر کی روشنی اور دھوپ چھن چھن کے راستہ بناتی باریک لکیروں کی صورت نیم تاریک ڈیوڑھی میں نظر آتی رہتی تھی۔ اس وقت اگرچہ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ مغرب کا وقت بس ہوا ہی چاہتا تھا، لیکن روشنی کی یہ لکیریں اب تک واضح تھیں۔ جیسے ہی کاشف کی نظر دروازے پہ گئی، اچانک اسی وقت یہ لکیریں غائب ہو گئیں۔ جیسے کسی نے ان سوراخوں کا منہ بند کر دیا ہو، ساری درازیں بھر دی ہوں۔

''ابا......!'' اس نے پھنکارتی ہوئی سرگوشی کی۔ کوثر کے قہقہے، مروفاں کی کھی کھی، رانی کی شوخی اور مانو کی ریں ریں...... سب کچھ تھم گیا۔ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کے اس ڈیڑھ مرلے کے نیم کچے مکان کو سوئے ہوئے محل میں تبدیل کر دیا ہو۔ اگلے ہی لمحے بالے کے کھنکھارنے کی آواز نے گویا پھر کسی منتر کا کام دیا، سب بتوں میں جان پڑ گئی۔ کوثر نے سبزی کی ٹوکری اس چارپائی کے نیچے سرکائی جہاں کاشف اب ہل ہل کر زیر لب اپنا سبق دوہرا رہا تھا۔ خود وہ اٹھ کے کنڈے کھولنے چلی گئی۔ مروفاں نے پیڑھی پہ پڑا دوپٹہ اٹھا کے سر پہ رکھا اور انگلیوں میں پہنے رنگ برنگے چھلے سرعت سے اتار کے چولہے کے پیچھے چھپائے اور بڑے انہاک کے ساتھ سلور کی پچکی ہوئی دیگچی میں ڈوئی ہلانے لگی۔ مانو اپنا آنسوؤں سے اتر اور مٹی سے لتھڑا چہرہ

لے کر اندر چھپ چکی تھی اور رانی ستو کا شربت بنانے کے لئے شکر گھولنے لگی۔

''یہ ہنسی ٹھٹھول کس خوشی میں ہو رہا تھا؟'' اس نے آتے ہی اپنی کھوجی آنکھیں ایک ایک کے چہرے پہ گاڑتے ہوئے تفتیش شروع کی۔

''کوئی نئیں......'' کوثر نے صاف مُکر جانے میں ہی عافیت جانی۔

''ادھر کسے فرصت ہے ہنسنے کی۔ ہاں وہ مانو گر گئی تھی، وہ ہی گلا پھاڑ کے بھیں بھیں کر رہی تھی۔ بالے! تیرے کو تو اب رونے اور ہنسنے میں فرق ہی نہیں لگتا۔''

''زیادہ بکواس نہ کر، سارا زمانہ کونے میں لگا کے آتا ہوں، یہ چلی ہے مجھے کونے میں لگانے۔ بتا کیوں ہنسی اُبلی پڑ رہی تھی ان کڑیوں کی۔ کہاں سے ہو کے آئی ہیں؟'' اس نے کوثر کا بازو زور سے ہلایا۔ سارے دن کی محنت مزدوری اور پھر پچھلے ایک گھنٹے سے سبزی بنانے کے بعد اس کے پٹھے ویسے ہی اکڑے ہوئے تھے۔ اب تو جیسے ہل کے رہ گئے۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

''مکر نہ کر...... چھری نہیں پھیر دی تیر گردن پہ۔ سچ سچ بتا کہیں آج پھر کام ہلکا کرنے کے لیے کسی کڑی کو تو اپنے ساتھ کوٹھی پہ نہیں لے گئی۔ اپنا کام ہلکا کرانے کی خاطر میری عزت تو ہلکی نہیں کر آئی۔''

''بالے! وہ میری بھی بیٹیاں ہیں۔ تو تو ایسے روز پچھ پریت (تفتیش) کرتا ہے جیسے میں ان کی ماں نہیں، کوئی لڑکیاں بیچنے والی کٹنی ہوں۔ اگر کسی دن ساتھ لے بھی گئی تو اپنے پلو میں چھپا کے لے جاؤں گی۔ جیسے مرغی اپنے پر میں اپنے چوزوں کو لے جاتی ہے۔ آخر آنڈی گوانڈی (آس پاس) کی کتنی زنانیاں کڑیاں ساتھ لے کے جاتی ہیں۔''

''لے جاتی ہوں گی۔ اچھی طرح جانتا ہوں میں ان زنانیوں کو بھی، ان کی کڑیوں کو بھی...... اور ان کے گھروں کے بے غیرت مردوں کو بھی۔ میں اقبال دین راجپوت ہوں۔ ان کی طرح چوڑا چمار نہیں۔ یہ تو غربت نے یہ دن دکھا دیئے، ورنہ راجپوتوں کی عورت کا کبھی ساتھ والے گھر کی عورت تک نے منہ نہ دیکھا تھا۔ کہاں وہ گھر گھر کام کرنے جاتی۔ وہ تو اور بات ہے کہ تو راجپوت نسل کی نہیں مگر میری کڑیاں راجپوت نسل کی ہیں۔ وہ لوگوں کے فرش پہ پوچا لگانے یا کسی کی گندی نظروں میں تماشا بننے والی نہیں۔''

اس نے وہ تقریر کی جو وہ ہفتے میں دو تین بار تو ضرور ہی کرتا تھا۔ مروفاں نے اپنی ناگواری چھپانے کے لیے منہ تقریباً سارا ہی گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ رانی کے منہ کے زاویے بھی ٹیڑھے ہو رہے تھے، بالے نے اس کے ہاتھ سے ستو کا گلاس پکڑتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ مروفاں کی نسبت وہ بھرے بھرے جسم کی مالک تھی۔ اس کی اٹھان بھی اچھی تھی۔ مروفاں کے تو بڑے ہونے کا اسے پتا ہی نہیں چلا مگر رنگ کے کالی...... توے سے زیادہ سیاہ رانی آج کل بری طرح آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔

"یہ سرمہ کیوں ڈوئی بھر کے دیدوں میں ڈال رکھا ہے۔" اس نے بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد سوال کیا۔

"آنکھوں میں رڑک (خارش) ہو رہی تھی ابا!" اصل وجہ یہ تھی کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اسے اپنی سیاہ رنگت اور بھینگی آنکھیں بری لگنے لگی تھیں اور وہ ان کو چھپانے کے لئے آئے دن کوئی نہ کوئی تدبیر کرتی رہتی تھی۔ یہ سلائیاں بھر بھر سرمہ اسی لیے بھرا تھا کہ ان کی سیاہی میں الجھ کر آنکھوں کا بھینگا پن کسی کو نمایاں طور پہ محسوس نہ ہو۔

"تیری رڑک تو میں نکالتا ہوں۔" اس نے گلاس خالی کر کے اس کی جانب پوری طاقت سے پھینکا۔ بچتے بچتے بھی اس کی کہنی تانبے کے بھاری گلاس کی زد میں آ گئی۔ وہ درد سے دوہری ہوتی، لب دبا کے چیخ روکتی وہیں کچی مٹی کے صحن میں بیٹھ گئی۔

"گھر آ کے بھی تیرا سارا دھیان ان ہی کوٹھیوں اور ان کے صاحبوں میں اٹکا رہتا ہے، اپنے بال بچوں کی فکر رہی نہیں۔ کیسے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ ایک یہ بڑی ہے۔" اب اس نے کوثر کو طعنہ دینے کے ساتھ ساتھ خاموش بیٹھی مردفاں کو بھی گھسیٹ لیا۔

"گوڈوں میں سر دے کے نجانے کیا منصوبے بناتی رہتی ہے۔ دیکھنا ایک دن سویرے اس کی منجی خالی ملے گی۔"

"انشاء اللہ۔" مردفاں نے دل ہی دل میں پورے جذبے سے کہا اور توے سے پھولی ہوئی روٹی اتار کے چنگیر میں رکھی۔ کٹورے میں سالن نکال کر ماں کو لے جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس نے آج ہی بالوں میں مہندی لگائی تھی جو سر ڈھکا ہونے کی وجہ سے شاید چھپی رہتی مگر بال رنگنے میں مہندی سے انگلیاں جو لال ہو گئی تھیں، وہ بالے سے اوجھل نہ رہتیں، اس لیے اس نے خود کھانا آگے رکھنے سے گریز ہی کیا۔

کاشف تختی لکھنے کے دوران گاہے بگاہے کن اکھیوں سے دائیں جانب دوسری چارپائی پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھے باپ کو بھی دیکھ لیتا تھا جو روٹی کے بڑے بڑے لقمے منہ میں ڈال رہا تھا۔ گویا یہ بھی کسی کی نعمت پہ کوئی جتا کے کیا جانے والا احساس ہو۔ تین لقموں میں روٹی برابر ہو جاتی اور کوثر لپک کے مردفاں کے ہاتھ سے دوسری روٹی چنگیر میں ڈال دیتی۔ گرم گرم تازہ روٹی کی مہک کاشف کی بھوک کو بے چین کرنے لگی۔ ماتو کی بھوک سب سے کچی تھی، وہ اگر پیٹ بھر کر بھی بیٹھی ہو تو کسی کو کھاتے دیکھ کے رال ٹپکانے لگتی تھی۔ سب بھی رونا دھونا اور جھاڑو کی مار بھول کے کوٹھڑی کے کواڑ سے اپنا تیل میں ڈوبا اور جوؤں سے بھرا سر نکال کے دیکھ رہی تھی۔

"کچے ٹینڈے۔" کھا پی کر چنگیر پرے کرتے ہوئے بالے نے تبصرہ کیا اور لمبی سی ڈکار لیتے ہوئے

دودھ پتی کا آرڈر دیا۔

''الانچی ڈال دینا تا کہ کچے ٹنڈے کھانے سے پیٹ میں درد نہ شروع ہو جائے۔''

چولہا ایک ہی تھا۔توا اتار کے چائے کی دیگچی چڑھانی پڑی۔ دروازے کے اس پار مانو مایوس ہوکر واپس کوٹھری کے اندھیرے میں گم ہوگئی۔ کاشف بھی جھنجھلائی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔ وہ نظریں جو ''بھوک......بھوک......'' چلا رہی تھیں۔کوثر نے نظریں چرالیں اور کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک پڑیا برآمد کی جس میں چار الانچیاں بند تھیں۔

''کب سے دیکھ رہا ہوں تو چار لفظ لکھ کے بیٹھا ہے۔ پڑھنے میں دل نہیں لگتا کیا؟'' آخر کار کاشف پہ بھی نظر کرم ہو ہی گئی۔اس کا دل جیسے زور کا دھکا کھا کر آگے کی طرف گرا۔

''ابا! اتنا ہی کام ملا تھا۔'' منمناتی آواز میں اس نے جواب دیا۔

''تو کرنے کیا جاتا ہے سکول؟ اتنی فیس لے کے یہ دو لائنیں لکھنے کا کام دیتے ہیں۔ ایسے تو تو کر چکا دسویں پاس، بلکہ پہلی جماعت سے ہی آگے نکل جائے تو بڑی بات ہے۔''

''ابا اس سال میں دوسری جماعت کا امتحان دینے والا ہوں۔ تیسری میں جاؤں......'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بالے نے اپنی پشاوری چپل گھما کر اسے دے ماری۔ بے خبری میں وہ اپنا بچاؤ اس کامیابی سے نہ کر سکا جیسا کہ رانی نے کیا تھا۔چپل ٹھیک اس کے منہ پہ لگی۔ چائے میں چینی ڈالتی کوثر کا ہاتھ کانپ سا گیا۔ آٹھ سالہ کاشی میں اس کی جان تھی۔ وہ زبان سے کچھ بھی کہہ لیتی مگر اس کے بھولے بھالے معصوم چہرے پہ ہلکا سا تھپڑ مارنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کبھی، اور بالے کو یہ ستم ڈھاتے دیکھ کر وہ سوائے دل ہی دل میں صلواتیں سنانے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ اب بھی وہ یہی کر رہی تھی۔

''مویا...... ہاتھ ٹوٹیں کم بخت کے جو سامنے نظر آتا ہے، کھینچ مارتا ہے۔ کڑی بازو پکڑے بیٹھی ہے اچھا بھلا وزنی گلاس دے مارا لڑکی ذات کو۔ کوئی نقص ہو گیا تو کس نے پوچھنا ہے، پہلے ہی وچاری شکل کی ماڑی ہے۔ اب اتنی موٹی جوتی ذرا سے لونڈے کو دے ماری۔ ڈر کے مارے وچارہ رو بھی نہیں پا رہا۔ اللہ کرے تجھے بھی کسی کی جوتی لگے، موئے...... میری اولاد کو دکھ دینے والے۔'' وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہی تھی یہ اس کا روز کا کام تھا۔

''تیسری میں جائے گا......تو رعب کس بات کا ڈال رہا ہے۔ آج میں پڑھانا ختم کروں تو کیے جائے تیسری میں۔

''ہیں...... تیری ماں کے یار آ کے تیری فیس نہیں بھر جاتے، نہ ہی تیرے مامے یا نانا تیری کتابیں دے جاتے ہیں۔ تیرے نانکوں کی سات نسلوں میں کسی نے کتاب کی شکل نہیں دیکھی۔ یہ میرا احسان ہے

تجھے پڑھا رہا ہوں، ورنہ بیٹھا ہوتا تو بھی کسی پنکچروں والی دکان پہ کام سیکھنے یا پھر کسی تنور پہ گاہکوں کو گرم روٹی اور سالن پکڑانے کے لیے۔ سیدھی طرح پڑھنا ہے تو بتا۔ یہ گڈیاں اڑانا، کینچے کھیلنا، یاروں دوستوں کے ساتھ پھرنا بند۔ آج کے بعد تجھے گلی میں دیکھا تو خیر نہیں تیری، سمجھا۔"

اس نے خالی خولی زبانی سمجھانے کو کافی نہ جانتے ہوئے اپنے ہتھوڑے جیسا ہاتھ اس کی گدی پہ رسید کیا۔ کاشف بلبلا کے رہ گیا۔

"کڑیوں کی طرح "ہائے......اوئی" کیوں کرتا ہے؟ راجپوتوں کے گھر زنخے نہیں پیدا ہوتے۔"

بالے نے اس کے احتجاج پہ طیش میں آکر اس کا منحنی سا بازو مروڑ ڈالا۔ اس بار اگرچہ کاشف نے چیخنے کی غلطی نہیں کی تھی مگر آٹھ سالہ بچے کے ضبط کی انتہا کیا ہوسکتی ہے۔ اس کا اندازہ کوثر اس کے درد سے پیلے پڑتے چہرے اور باہر کو ابلتی آنکھوں کو دیکھ کے کرسکتی تھی۔ اس کی پلکیں نم ہو کر بھاری ہوگئیں۔

آج پھر وہ لمبا چکر کاٹ کر اس راستے سے گزر رہا تھا۔ کتنے ہی دن پہلے وہ مجبوراً بڑی سڑک سے اس لیے گزرا تھا کہ سکول سے اس کے گھر کی طرف جانے والا مختصر مگر کچا راستہ رات بھر مسلسل بارش کے بعد کیچڑ اور گارے سے لت پت تھا۔ کئی گڑھوں میں تو پانی کھڑا تھا۔ کوثر نے اسے سختی سے کہا تھا۔

"بڑی والی سڑک پہ پڑ جانا اور واپسی پہ بھی وہیں۔" ناچار اسے بڑی سڑک سے آنا پڑا۔ حالانکہ وہاں کی ٹریفک اسے خاصا ہولاتی تھی۔ سڑک پار کر کے پتلی گلی تک جانا محال لگتا لیکن ایک چیز تھی وہاں جس کی کشش نے اسے مجبور کیا کہ وہ دوسرے دن پھر وہاں سے گزر رہا تھا۔ حالانکہ دو دن کڑاکے کی دھوپ نکلی تھی جس نے سارا کیچڑ سکھا کے خشک کر دیا تھا۔

راستے میں آنے والے بڑے سے پٹرول پمپ میں رنگ برنگے عجیب سے جوکروں والے لباس میں ملبوس اور چہرے پہ مکی ماؤس کا ماسک لگائے وہ ناچتا گاتا، بچوں میں ٹافیاں بانٹتا شخص......

اس شخص نے فوراً ہی اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ خاصی مصروف شاہراہ تھی یہ اور اس پہ بنا یہ پٹرول پمپ بھی اتنا ہی رش لیتا تھا۔ دوپہر کے اس وقت بھی ایک گاڑی جاتی تھی تو تین آتی تھیں۔ زیادہ تر لوگ بچوں کو سکول سے لا رہے تھے۔ جتنی دیر تک وہ پٹرول فل کرواتے۔ جوکروں جیسے لباس اور مکی ماؤس کے ہنستے مسکراتے ماسک والا یہ شخص گاڑی میں بیٹھے بچوں کے ساتھ چہلیں اور اٹکھیلیاں کرتا، کبھی ان کے بال لاڈ سے سہلاتا۔ زیادہ چھوٹے بچوں کو گود میں لے کر گدگداتا۔ کسی کے گال پہ پیار سے ہاتھ پھیرتا تو کسی بچی کی پونی ٹیل ہولے سے کھینچتا۔ اپنے بلیک ڈاٹس والے ریڈ کلر کے کھلے سے پاجامے کو چٹکیوں میں اٹھا کے چابی والے کھلونے کی طرح ناچ کے انہیں ہنساتا۔ بڑے بڑے پیلے کالروں، لال جھالر والی سبز قمیض کی بڑی سی نیلی جیب میں سے میٹھی گولیاں بھی نکال کے تھماتا۔

وہ کتنی ہی دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

ایک کے بعد ایک گاڑی آتی تھی۔ وہ درجنوں بچوں کا دل بہلاتا رہا مگر نہ تھکا۔ کاشف اسے دیکھ دیکھ کے تھک گیا تھا مگر وہ نہ تھکا۔ کتنی بار اسے ستانے کے لیے بیٹھتا دیکھ کر کاشف سوچتا۔ اب یہ جو گاڑی آتی ہے اس میں بیٹھے ہوئے اس بچے کو یہ پیار کرنے بالکل نہ اٹھے گا جو شکل سے ہی اتنا بدتمیز لگ رہا ہے مگر وہ حیران رہ جاتا جب جو کر ڈھنگ سے ستا بھی نہ پاتا اور فوراً کھڑا ہو جاتا۔ نئے جوش وخروش سے ناچنے اور ہنسانے کے لیے۔

''دن میں کتنے بچوں کو پیار کرتا ہوگا یہ مکی ماؤس مگر نہ اس کا دل بھرتا ہے، نہ تنگ پڑتا ہے، نہ ہی یہ تھکتا ہے۔ کتنا اچھا ہے نا مکی ماؤس!''

اس نے اپنے ساتھی زاہد سے کہا جو اس کے برابر والے گھر میں رہتا تھا اور اس کے ساتھ ہی سکول جاتا تھا۔

''پاگل یہ کوئی سچ مچ والا مکی ماؤس تھوڑا ہے۔ اصلی والا بندہ ہے۔ منہ پہ کچھ چڑھایا ہوا ہے۔'' اس نے اپنی قابلیت جھاڑی۔

''جو بھی ہے لیکن ہے تو اچھا نا۔ اتنا پیار کرنے والا، کاش یہ میرا دوست ہوتا۔''

''لے...... یہ کوئی تیری عمر کا ہے۔ پتا نہیں کتنی عمر کا ہو۔ بیس سال کا...... تیس سال کا...... یا پھر پچاس سال کا۔ تیرا دوست کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہاں، واقعی پتا نہیں یہ کتنا بڑا ہو، دیکھنے میں کیسا لگتا ہو۔'' اچانک اس کے دل میں اس کا اصل چہرہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

''لیکن ایک بات ہے زاہد! یہ چاہے میرا دوست نہ بن سکتا ہو مگر میرا دل چاہتا ہے کہ یہ میرا کچھ نہ کچھ ضرور بنے۔ یہ بچے اس کے کچھ نہیں لگتے پھر بھی انہیں کتنا پیار کرتا ہے۔ اگر میں اس کا کچھ لگتا تو پھر یہ مجھے کتنا پیار کرتا۔''

''پاگل ہے تو بھی۔ چل اب ہل یہاں سے، دیر ہو رہی ہے۔'' زاہد نے اسے کھینچا۔

اس دن کے بعد بھی وہ کئی بار صرف اسے دیکھنے کی خاطر وہاں آتا رہا۔ وہ اسی دلجمعی سے بچوں میں محبتیں بانٹنے میں مصروف نظر آتا۔

اسے دیکھتے ہی کاشف کی آنکھوں میں حسرتیں یہاں سے وہاں تک پھیلنے لگتیں۔

☆

ارے بنٹی بابا! آپ ادھر کیوں نکلے۔ چلو شاباش، اندر چلو۔ یہاں بہت گرمی ہے۔''

کاشف بڑی دلچسپی سے اس دو اڑھائی سالہ گول مٹول سنہری بالوں والے بچے کو دیکھ رہا تھا جو بہت خوبصورت رنگوں والی ٹرائی سائیکل چلاتا لان میں چلا آیا تھا۔ وہ اس خوش وضع چلتے پھرتے کھلونے کو دیکھنے میں محو تھا جو اس سے قبل کبھی کتابوں رسالوں میں دیکھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس نرم لہجے اور پیار بھرے لفظوں پہ یونہی گردن گھما کے بولنے والے کو دیکھنا چاہا۔ اسے ایک دھچکا سا لگا تھا وہ کوئی اور نہیں، اس کا باپ بالا تھا۔ اقبال دین عرف بالا۔ اس وسیع وعریض کوٹھی کا گیٹ کیپر۔

جس کے دل میں نجانے کیا آئی کہ وہ کوثر کے ایک بار کہنے پہ اسے اپنے ساتھ کوٹھی لے آیا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے کاشف لان میں جامن کے گھنے پیڑ کے سائے میں نرم گھاس پہ بیٹھا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ رات کو یہاں بڑے صاحب کے پہلے پوتے بنٹی کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ انتظامات میں بالا آگے آگے تھا۔ کوثر نے یہی کہہ کے کاشف کو اس کے ساتھ کیا تھا۔

''بالے! اس کو بھی ساتھ لے جا، ذرا رونق میلہ دیکھ لے گا۔ کونسا کہیں آتا جاتا ہے اور کچھ نہیں تو کام میں تیرا ہاتھ ہی بٹا دے گا۔ بعد میں اچھی سی روٹی بھی کھانے کو مل جائے گی۔''

وہ اپنے ہوش میں پہلی بار ابے کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے دل عجیب احساسات کا شکار تھا۔ ایک طرف ڈر تھا کہ سارے دن کے بعد شام کو گھر آنے والا اس کی ذرا سی لغزش پہ چوکنے والا نہیں تھا اور یہ تقریباً سارے دن کا ساتھ ہے۔ اماں بھی نہیں بچانے والی۔ کہیں کسی بات پہ گرمی کھا کر ابا وہیں نہ پیٹنے لگ جائے۔ دوسری طرف یہ خوشی بھی تھی کہ آج پہلی بار وہ اس کے ساتھ باہر جا رہا ہے۔ خوب نہا دھو کے، صاف شلوار قمیص پہن کر۔ مگر اقبال دین شاید اسے یہاں لا کے بھول ہی بیٹھا تھا اور اب......

اب اس کی آواز سن کر کاشف ہکا بکا تھا۔ اس نے بھلا کب اس کا اتنا نرم لہجہ اور میٹھے الفاظ سنے تھے۔

''بنٹی بابا کو گرمی لگ جائے گی، بنٹی بابا بیمار ہو جائیں گے۔'' وہ مسلسل اسے پچار رہا تھا۔

''کیا فضول بکواس کر رہے ہو؟'' بڑی بیگم صاحبہ جو بنٹی بابا کی دادی تھیں۔ پتا نہیں کب باہر نکلیں اور ناگواری سے بالے کو جھاڑ کے رکھ دیا۔

''کیا منحوس قسم کی رٹ لگا رکھی ہے اقبال دین! تم نے۔''

وہ شاید خاصی وہمی قسم کی خاتون تھیں جو اس کی بات دل پہ لے گئی تھیں۔

''وہ بیگم صاحبہ! بنٹی بابا دھوپ میں باہر آ گئے تھے۔ میں تو اندر بھیجنے واسطے کہہ رہا تھا۔ میرے منہ میں خاک، بنٹی بابا کو تو میری عمر بھی لگ جائے۔''

راجپوت نسل کا چشم و چراغ اس وقت خیرات اور صدقہ مانگنے والوں کے سے انداز میں جھولی اٹھا کے دعائیں دے رہا تھا۔

آٹھ سالہ کاشف نے آنکھیں پھاڑ کر اور منہ کھول کے بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ اس کے بات بات پر کاٹ کھانے والے باپ کے لہجے میں عاجزی تھی اور وہ گھگھیا رہا تھا۔

بلا تکلف ہاتھ اٹھا لینے والے کے ہاتھ اس وقت بندھے ہوئے تھے۔ تیوریاں چڑھا کر کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے والے پہ اس وقت سرتا پیر انکساری ہی انکساری چھائی ہوئی تھی۔ اپنی اولاد کو بھول کے بھی میٹھی نظر سے نہ دیکھنے والا اچانک ہی ایک بالکل انجان، بالکل غیر بچے کے لاڈ اٹھانے لگا تھا۔

''چلو بنٹی بابا! اندر چلو۔ بالے چاچا کی گودی میں اندر چلو...... چلو جی...... بالے چاچا، بنٹی بابا کو گھوڑا بن کے دکھائیں گے۔'' وہ اس روتے چلاتے بچے کو گود میں اٹھائے اندر جا رہا تھا۔

ابھی کاشف جی بھر کے حیران بھی نہ ہو پایا تھا کہ ایک اور منظر اس کے سامنے تھا۔ ایک چودہ پندرہ سالہ صحت مند اور خوبصورت سی لڑکی اپنی پونی ٹیل جھلاتی باہر نکلی۔ اس کے بھرے بھرے جسم پہ وائٹ چست ٹراؤزر اور سلیولیس شوخ رنگوں کی فٹنگ والی شرٹ تھی۔ میک اپ اور جیولری کا بھی مناسب استعمال کیا گیا تھا۔

''ڈرائیور...... ڈرائیور......!'' وہ آخری سیڑھی پہ لمبی ہیل والی سینڈل ٹکائے ادھر سے ادھر انتظامات میں مصروف ملازمین اور انٹیریئر مینجمنٹ والے سٹاف میں سے ڈرائیور کو ڈھونڈ رہی تھی۔

''بے بی! گل زمان کو بڑے صاحب نے آفس بلوایا ہے۔'' بالا، بنٹی بابا کو اندر آیا کے حوالے کر کے آ رہا تھا۔

''اوہو...... صفدر کو بھی مام مارکیٹ لے گئی ہیں۔ اب میں اپنی فرینڈ کی طرف کیسے جاؤں؟''

''میں لے جاتا ہوں بے بی! آپ بڑی بیگم صاحبہ سے کالی والی گاڑی کی چابی لے آؤ۔''

''شیور...... تم ڈرائیو کر لو گے نا!'' وہ کچھ مشکوک تھی۔

''جی بے بی! آپ فکر ہی نہ کرو۔ اب ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری مومو بے بی تیار ہو کے آئیں اور اپنی سہیلی کی طرف نہ جا سکیں۔ اقبال دین کے ہوتے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم بھلا اپنی مومو بے بی کو اداس دیکھ سکتے ہیں۔'' وہ مسلسل مسکراتا ہوا کاشف کو بہت اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔

''یہ تمہارا بیٹا ہے اقبال دین!'' گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ اپنا بیگ پھینکتے ہوئے مومو نے ایک اچٹتی ہوئی نظر کاشف پہ ڈال کے پوچھا۔

''لے لو اسے بھی ساتھ۔''

''نہیں مومو بے بی! رہنے دیں۔ بڑی بیگم صاحبہ ناراض ہوں گی۔ اسے کہاں تمیز ہے ان بڑی گاڑیوں میں بیٹھنے کی۔'' وہ اپنے بیٹے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رہا تھا۔

''ابا کو اس فیشنی لڑکی کے رنگے ہوئے ناخن اور ہونٹ نظر نہیں آئے؟ کھلے ہوئے بال انہیں دکھائی

نہیں دیے؟ اس نے دوپٹہ صحیح طرح سر پہ تو کیا لینا تھا، گلے میں بھی نہ ڈالا تھا پھر بھی ابا کتنے پیار سے اس سے بات کر رہا تھا۔ وہ تو کہتا ہے مجھے ہونٹ اور ناخن رنگنے والی لڑکیاں زہر لگتی ہیں۔ مروفاں باجی اور رانی، مانو کو ہر وقت جھڑکتا رہتا ہے۔ وہ منہ دھو کر پاؤڈر بھی لگا لیں تو انہیں مار پڑ جاتی ہے۔"

گھر واپسی پہ وہ یہ ساری باتیں ماں کو بتائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا خیال تھا اس کی زبانی اپنے غصیلے شوہر کی نرم مزاجی اور پرائے بچوں سے لاڈ کی بات سن کر وہ بھی اتنی ہی حیران اور اداس ہو گی جتنا کہ وہ...... مگر کوثر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو نے روٹی تو پیٹ بھر کے کھائی؟ کیا کچھ تھا کھانے میں؟ ٹھنڈی بوتل ملی؟"

"ہاں ملی۔ پر اماں! میں کیا کہہ رہا تھا...... وہ ابا......"

"ہاں تو کیا ہوا تیرے ابے کو؟" اسے خاصی دلچسپی نہ تھی۔

"وہ ابا...... گھر والے ابے جیسا نہ تھا۔ وہ تو دوسرا ہی تھا، بالکل دوسرا۔ جیسے کوئی اور۔"

"ہاں تو وہ کوئی اور ہی تو تھا۔ وہ تیرا ابا تھوڑا ہی تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکا۔

"پاگل! ابا تو وہ تیرا ہے نا، ان کوٹھی والوں کا تو نہیں۔ وہاں تو وہ اقبال دین چوکیدار ہے۔ ان کے درجن بھر نوکروں میں سے ایک۔ ان کے دو چوکیداروں میں سے دن کے ٹیم نوکری کرنے والا۔ وہاں اس نے کس کو ابا بن کے دکھانا تھا، وہاں تو وہ چاکری کرنے گیا تھا۔"

"نوکر بننے کے لیے بدلنا ضروری ہوتا ہے؟" بہت سوچنے کے بعد اس نے سوال کیا جو اس کی عمر اور ذہن کے لحاظ سے خاصا وزنی تھا۔ اس کے سر میں کڑوا تیل لگاتی کوثر کے ہاتھ تھم سے گئے۔ چند سیکنڈ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

"بس پتر......!" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"نوکری کی تے نخرہ کی......؟"

یہ محاورہ کاشف کو ہضم نہ ہوا لیکن اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ اگرچہ اس کے سوالات کی ابھی تک بھرمار تھی دل و دماغ میں۔"

☆

"آج پھر تو بڑی سڑک پہ پڑنے لگا ہے۔"

اس کا رخ دوسری جانب دیکھ کر زاہد نے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔

"باز آجا یار! اتنی گاڑیاں ہیں اور تو منہ اٹھا کے اس باندر (بندر) کی شکل والے کو دیکھے جاتا ہے اور

چلتا جاتا ہے۔ کسی دن کسی بس کے نیچے آجائے گا۔ وہ تجھے کونسا گولیاں ٹافی دے دیتا ہے تو جو تو اس پہ اتنا مرتا ہے۔"

"بس وہ مجھے اچھا لگتا ہے، وہ ہے ہی اچھا۔" کاشف نے زبردستی اسے اپنے ساتھ گھسیٹا۔

"پاگلے، تجھے بتایا تو ہے وہ اس کی اصل شکل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی اصلی شکل اتنی ڈراؤنی ہو کہ تو اسے دیکھ کے ہی ڈر جائے، ہونہہ...... اچھا لگتا ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ مجھے اس کی شکل اچھی لگتی ہے۔ ایسی بنی بنائی شکلیں تو بازار میں مل جاتی ہیں۔ کوئی بھی منہ پہ لگا لے مگر کوئی اتنا پیار کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ جتنا وہ ہے۔ دیکھا نہیں، سارا سارا دن بھی بچوں کو پیار کرتے نہیں تھکتا۔ پتا ہے زاہد میرا دل کرتا ہے، میں بھی بڑا ہو کے ایسا ہی جوکر بنوں، اسی طرح بچوں کو پیار کروں اور دیکھنا میں ایسا ہی کروں گا۔"

"اوئے تو جوکر بنے گا؟" زاہد کھلکھلا کے ہنس پڑا مگر اب کاشف نہ اسے سن رہا تھا، نہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ جوکر کی جانب تھی۔ وہ گاڑی میں سے سال ڈیڑھ سال کی ایک بچی کو نکال رہا تھا جو بری طرح رو رہی تھی۔ جوکر نے اسے اپنی گود میں اٹھا کے اچھلنا، ناچنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی گیت بھی گنگنا رہا تھا۔ روتی ہوئی بچی چپ ہوگئی۔ آنسو اس کے گالوں پہ تھم چکے تھے اور اب وہ اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں میں دلچسپی سمیٹے اس کی حرکتیں دیکھ رہی تھی پھر اچانک اس کے معصوم چہرے پہ مسکراہٹ ایک کرن کی طرح پھوٹی۔

"دیکھا؟" کاشف نے یوں فاتحانہ اور جتانے والے انداز میں زاہد کو دیکھا جیسے یہ کارنامہ اسی کا ہو۔

"وہ تیرا جوکر تو اندر جا رہا ہے۔" زاہد کے کہنے پہ کاشف نے بے چینی سے سروس اسٹیشن کے عقب میں بنے واش روم کی جانب دیکھا۔ کاشف کے دل میں ایک بار پھر شدت سے اس کی اصل شکل دیکھنے کی تمنا جاگی۔ وہ زاہد کے روکنے کے باوجود دیوار کے ساتھ لگتا لگتا وہاں جا پہنچا اور ایک بڑی گاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد ایک دبلا پتلا زرد رو، آدھے گنجے سر والا آدمی واش روم کا دروازہ کھول کے نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مکی ماؤس والا ماسک تھا اور بازو پر جوکر والا لباس۔ زمین سے شاپر اٹھا کے اس نے یہ چیزیں اس میں ڈالیں۔ گملے کے پیچھے سے سلور اسٹیل کا ٹفن نکالا اور تھکے تھکے قدموں سے چل پڑا۔

"اوئے تو کدھر......؟" زاہد نے اسے اس کا پیچھا کرتے دیکھ کے کہا۔

"چل آ یار! اس کے پیچھے چلتے ہی، اس کا گھر دیکھتے ہیں۔"

"دماغ خراب ہے کیا؟ پتا نہیں وہ کتنی دور رہتا ہو۔"

"دور رہتا ہوگا تو ویگن یا بس پہ چڑھے گا پھر ہم اپنے راستے پر آ جائیں گے اور اگر پیدل چلتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا گھر نزدیک ہے۔" کاشف نے پتے کی بات کی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ

اسی پتلی گلی میں مڑ گیا جس کے راستے وہ اپنے محلے کی طرف نکلتے تھے۔ان کے محلے کو جانے والی گلی سے پہلے والی گلی میں وہ مڑا تو زاہد کے منع کرنے کے باوجود کاشف بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چند قدم چل کے وہ ایک ایسے دروازے پہ رک گیا جو بالکل اس کے گھر کے دروازے جیسا تھا۔ ویسا ہی چیں چیں کرنے والا......اتنا ہی بدرنگ اور اتنا ہی پرانا۔ گھر بھی کاشف کے گھر کی طرح آدھا کچا اور آدھا پکا تھا۔

''چل گھر دیکھ لیا......اب آ، واپس چلیں۔'' مگر کاشف ہاتھ چھڑا کے آگے بڑھ گیا۔ ٹاٹ کا پردہ ذرا سا ہٹا کر اس نے اندر جھانکنا چاہا۔

''بے غیرتو......آوارہ کتو......دو گھڑی آرام نہیں لینے دیتے۔آتے ہی چخ چخ لگا دی ہے۔''

وہ اس کی عمر کے دو لڑکوں کو کالر سے پکڑے جھٹکے دے رہا تھا۔ اپنے بازوؤں میں اٹھا کے روتے بچوں کو چپ کرا دینے والے شخص کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں دو کم سن بچے تھے جن کے چہرے دہشت سے سفید پڑ چکے تھے۔اب اس نے ان کے گریبان چھوڑ کر ان کے چہروں پہ دو دو تھپڑ رسید کیے۔

''کتنی بار کہا ہے میرے آنے سے پہلے ان کمینوں کو باہر گولی مار دیا کرو۔ زمانے بھر کے بچے گلیوں میں رُلتے پھرتے ہیں۔ایک یہ ہیں جن کو چین نہیں۔میری جان عذاب میں ڈالنے کو اس ڈیڑھ فٹ کی کوٹھڑی میں سارا دن ریں ریں لگائے رکھتے ہیں۔'' اس بار اس نے اپنی بیوی کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

''جاؤ باہر گلی میں مرو۔ آرام کرنے دو مجھے۔'' اس نے انہیں باقاعدہ دھکے دے کر اور لات رسید کر کے باہر نکالا۔ اتنے میں اس کی نظر پردے کی اوٹ سے اندر جھانکتے کاشف پہ پڑی۔

''اوئے کون ہے......؟'' اس نے اپنے لڑکوں میں سے ایک سے پوچھا۔ نفی میں جواب ملنے پہ اس نے کاشف کو تھپڑ مار دیا۔

''چور لگتا ہے شکل سے۔ بتا، کیوں اندر جھانک رہا تھا۔''

کاشف بے چارہ کیا بولتا، وہ تو تب بھی اتنا حیران نہ ہوا تھا جب اپنے ہر وقت غصے میں رہنے والے باپ کو بنٹی بابا اور موموبے بی کے نازنخرے اٹھاتے دیکھا تھا۔ تب بھی حیرت ہوئی تھی مگر نہ تو اس کا دورانیہ اس قدر طویل تھا نہ ہی اثرات اتنے دیرپا۔ اس وقت تو گویا وہ گنگ بنا کھڑا تھا۔

''آئے ہے، رب نواز! ہمارے ویہڑے کسی نے کیا چوری کرنے آنا ہے۔ جانے دے، کسی غریب کا بال (بچہ) ہے۔'' اس کی بیوی نے سفارش کی۔

''چل بھاگ جا یہاں سے، آج کے بعد اس گلی میں نظر نہ آنا'' اس نے تاکید کے طور پہ ایک اور دھموکا اس کی کمر پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کے دور گرا اور پھر زاہد کے سہارا دینے پر کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆

آج کتنے سالوں کے بعد وہ سوال کاشف کے سامنے تھا جو بچپن میں کبھی اس نے اپنی ماں سے کیا تھا۔اس سوال کا جواب اس کی ماں نے دیا تھا مگر اس کی تسلی نہ ہو سکی تھی۔

اس سوال کا جواب قدرت نے اسے رب نواز......اس......بکی ماؤس والے آدمی کے اصل رویے کی صورت بھی دیا تھا مگر وہ جان نہ سکا۔سمجھنا اور جان لینا دو بالکل الگ کیفیات ہیں۔

یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ رب نواز بچوں سے پیار نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے بچے اٹھانا، انہیں پیار کرنا اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔اس کام کے اسے پیسے ملتے تھے۔

یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ گھر میں ہر بات میں اپنی چلانے والا، اس کا حاکمیت پسند اور سخت گیر باپ اگر اپنے مالکوں کے بچوں کی بدتمیزیاں ہنس کے سہہ جاتا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے اپنی نوکری پیاری تھی۔

مگر وہ یہ نہ جان سکا کہ......ابھی ابھی مانو کے گلے نے اسے آگہی کے اس موڑ پہ اچانک لا کھڑا کیا۔

مروفاں کی شادی آج سے دس سال پہلے ہو چکی تھی۔اب تو اسے بیوہ ہو کر دوبارہ میکے آئے بھی چار سال ہو رہے تھے۔جیسا شوہر اقبال دین نے بیٹی کے لیے ڈھونڈا تھا، اس کا چھ سال زندہ رہنا بھی تو بڑی بات تھی۔

رانی، جس کی شکل وصورت سب سے کم تھی اور جس کا گھر بسنے کی امید بھی نہیں تھی، وہ حیرت انگیز طور پہ ایک اچھے گھر کی بہو اور ایک محنتی مخلص شخص کی بیوی بن چکی تھی اور پچھلے اڑھائی سال سے اپنے گھر میں مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔

اقبال دین، مروفاں کے بیوہ ہونے کے چند مہینے بعد ہی مر گیا تھا اور اپنی تمام تر ذمہ داریاں اور چڑچڑاپن کاشف کو سونپ گیا تھا۔وہ اب گھرانے کا واحد کفیل ہی نہیں بلکہ واحد مرد بھی تھا۔

کوثر اب عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کام کاج کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ہوتی بھی تو کاشف کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی ماں گھر گھر برتن دھونے اور صفائیوں کا کام کرتی۔آخر وہ میٹرک پاس تھا، اس کی بھی چار لوگوں میں عزت تھی اور دوسری بات...... بالے کی طرح اسے بھی اپنے خالص راجپوتی خون ہونے کا پورا پورا احساس تھا۔مروفاں اجڑ کے اکیلی میکے نہیں آئی تھی، اس کے ساتھ تین بچیاں بھی تھیں۔چار افراد یہ......ایک بوڑھی ماں، ایک جوان بہن مانو اور ساتواں وہ خود۔

وہ بے غیرت تو تھا نہیں کہ جوان بہن یا کم سن بھانجیوں کو کمانے سڑک پہ لے آتا۔بے ضمیر بھی نہ تھا کہ ان ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر کہیں فرار ہو جاتا اور چھڑی چھانٹ بے فکر زندگی گزارتا۔

لیکن وہ کوئی اوتار بھی نہ تھا۔

ایک عام انسان تھا۔

ایسا ہی عام انسان جیسا کہ اس کا باپ اقبال دین تھا۔ کم حوصلہ، کم ظرف، کم ہمت۔
یہ چھ نفوس جو اس کے رحم و کرم پہ تھے، اس کی چڑ بن چکے تھے۔ ان کے پیٹ کے دوزخ بھرنے کے لیے اسے دن رات اپنا وجود مشقت کی بھٹی میں جھونکنا پڑتا تھا۔ ان کی خاطر اسے اپنی معمولی سے معمولی خواہش بھی بے دردی سے کچلنا پڑتی تھی۔
یہ چھ نفوس اس کو خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ شاید ویسے ہی جیسے کبھی اس کے ابے کو کھٹکتے تھے بہت کم عمری میں عملی میدان میں آ جانے کے باعث وہ اپنا بچپن فراموش کر چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی [illegible] کی ساری یادیں، سارے محسوسات بھی۔
آج انجانے میں بانو کے ایک ہلکے سے گلے نے اسے وہ سب کچھ یاد دلا دیا۔ وہ روز صبح دوپہر کھانا ساتھ باندھ کے لاتا تھا۔ بانو اس وقت سارے گھر کی صفائی کر رہی ہوتی جبکہ مروفاں ناشتے کے ساتھ ساتھ دوپہر کے لیے سالن بھی تیار کر لیتی اور کاشف کا ٹفن باندھ دیتی لیکن رات اس کی چھوٹی لڑکی بخار میں تپتی رہی تھی۔ صبح تک وہ اس کی پٹیاں کرتی رہی جس کی وجہ سے کھانا تیار ہونے میں دیر ہو گئی۔
”کسی کو احساس نہیں، میں سارا دن گرمی میں اپنے آپ کو پگھلا لیتا ہوں اور یہاں احسان ماننا تو ایک طرف، لحاظ تک رکھنا نہیں آتا۔ اب میں دوپہر کے کھانے میں بازار کے نان پکوڑے یا چنے کھا کے بیمار ہو جاؤں گا تو کسی کا کیا جائے گا۔“
”بس دس منٹ کی بات ہے، میں ابھی......“
”رہنے دے، رہنے دے...... تو لاڈ اٹھا اپنے بچوں کے۔ میں تو بیگار ڈھونے والا خچر ہوں۔ بھلا ڈنگروں کی بھی کوئی پروا کرتا ہے۔“ اس نے چائے کا مگ دیوار پہ دے مارا۔
”دس منٹ اور بیٹھ گیا تیرے ان آلو مٹروں کے لیے تو ادھر دکان کا مالک مجھے فارغ کر دے گا۔ پھر رونا مجھے، سارا ٹبر بیٹھ کے رونا میرا سیاپا۔“ وہ بکتا جھکتا وہاں سے نکل گیا جس کپڑے کی دکان میں وہ کام کرتا تھا وہ اس کے گھر سے نزدیک بازار میں ہی تھی۔ پیدل کا راستہ دس بارہ منٹ کا تھا۔ دوپہر کو بانو دسترخوان میں کھانا لپیٹ کے اسے دینے آئی۔ خاصا رش والا وقت تھا۔ دکان میں درجن بھر عورتیں ان تین لڑکوں کا سر کھا رہی تھیں جو انہیں نئے سے نیا پرنٹ نکال کے دکھا رہے تھے اور ان چرب زبان لڑکوں میں سے ایک کاشف بھی تھا۔
”میری باجی جان! اپنے بھائی کی مانیں، یہ پرنٹ آپ پہ بہت اچھا لگے گا۔“ وہ کسی گاہک کو قائل کر رہا تھا۔ بانو چادر کی بکل میں لپٹی وہیں کونے میں اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے بیٹھ گئی۔
”آنٹی جی! زیادہ نہ سوچیں، اپنے اس بیٹے پہ اعتماد کریں، بالکل پکے رنگ ہیں۔“
”پیاری آپا! یہ رنگ تو بنا ہی آپ کے لیے ہے۔“

''یہ کیا میری بہنا......صرف ایک سوٹ، کم از کم دو تو لیں، پلیز......''

وہ بڑے مہذب اور نپے تلے لہجے میں اپنی گاہک خواتین کو گھیر رہا تھا۔ ذرا رش چھٹا تو اس کی نظر مانو پہ گئی۔ وہ چونک سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں اسے ایک جانا پہچانا سا کرب ہلکورے لیتا نظر آیا۔

''کیا ہے؟'' اس نے اکھڑے لہجے میں گویا پتھر کھینچ مارا۔

''یہ کھانا......'' ٹفن آگے بڑھا کر وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ کاشف نے سوالیہ نظروں سے اسے جانچا۔

''کاشی......تو......تو ایسے بھی بول سکتا ہے، اس طرح بھی بات کر سکتا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے تیوری چڑھائی۔

''اس طرح پیار سے بات کرتے ہوئے تو بڑا اچھا لگا اور بھی اچھا لگتا اگر ان پرائی بہنوں کے بجائے اپنی سگی بہنوں سے پیار سے بات کرتا۔'' اس نے اپنی محروم نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''اونہہ...... پیار سے......'' اس نے سر ہلایا۔

''میری کیا لگتی ہیں جو میں پیار سے بات کروں۔ یہ تو میرا کام......'' شاید منہ میں کنکر آ گیا تھا یا شاید زبان دانتوں تلے آ گئی تھی، وہ رک سا گیا تھا۔

ایک مانوس سا درد اس کے چہرے پہ پھیل گیا تھا۔ اب بچپن کا درد...... جو بچپن وہ عرصہ ہوا بھلا چکا تھا۔

......❁......

سانجھ

جگن پورہ کی اس تنگ سی نشیبی گلی میں آج خوب رونق لگی تھی۔ ماجھے کی برات نکل رہی تھی اور ہجوم براتیوں کا اتنا نہیں تھا جتنا کہ تماشا دیکھنے والوں کا تھا۔ تماشا یہ نہیں تھا کہ ماجھے کی شادی ہو رہی تھی، اچنبھے کی بات تو یہ تھی کہ یہ شادی اس کی ماں بختاں کی زندگی میں ہو رہی تھی۔ پورے جگن پورہ کے لیے یہ شادی حیرت کا باعث تھی۔

''آئے ہائے نی، بختاں نے کلیجہ کیسے بڑا کر لیا اپنا پتر ویاہ رہی ہے، چوچے (چوزے) کی طرح ستائیس سال اسے دبوچ کے رکھا تھا۔ مجھے تو نہیں لگتا تھا کہ وہ پتر کی شادی کا حوصلہ کبھی کر سکے گی۔'' محلے کی سب سے بزرگ خاتون مائی رجی نے اپنے ڈھلکی اور لٹکی کھال والے گال پر انگلی رکھ کے حیرت کا اظہار کیا۔

''وہ چوچا اب پر پھڑ پھڑانے لگا تھا مائی!'' نصیبن جو چھ سات کوٹھیوں میں جھاڑو پونچھے کا کام کرتی تھی، اسے سنسنی خیز انکشافات کرنے کا شوق تھا۔ اس کے بیانات پہ کچا پکا سا یقین کرنے کے باوجود محلے کی عورتوں کو اس کی باتیں سننے کا چسکا بھی پڑا تھا۔

''ستائی (ستائیس) سال بوھت ہوتے ہیں۔ انسان کا بچہ ہے آخر اور ہے بھی مرد ذات۔ کتنا روک سکتی تھی بختاں اسے ہاتھ سے بس نکلنے ہی والا تھا، اچھا بندوبست کیا ماں نے۔''

''نی خاک ہاتھ سے نکلنا ہے اس نے!'' چھمو نے ہاتھ نچایا۔ وہ بختاں کے گھر کے بالکل برابر میں رہتی تھی دیوار سے دیوار ملی تھی۔ اس سے زیادہ اندر کے حالات سے اور کون واقف تھا۔

''ساہ بھی لینا ہو تو بے بے سے پوچھ کے لیتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اب ذرا باہر کی ہوا لگانے لگی تھی بختاں اسے، لیکن اپنی پکڑ ڈھیلی نہیں کی اس نے۔ باہر بھی اس لئے نکالنے لگی ہے کہ اب اس کی اپنی عمر ہو گئی ہے، دیکھنے میں چاہے نہ لگتی ہو پر ہے تو ساٹھ سے اوپر کی۔ کب تک تیرے میرے گھر چاکری کے جوان پتر کو گھر بٹھا کے کھلاتی۔ اس لیے آہستہ آہستہ اسے ہشیار کر رہی ہے۔ لیکن یہ بات بھول جا کہ ماجھو کبھی اس کے

ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ سارے زمانے کے لیے شیر بن سکتا ہے ماں کی ایک گھوری کی مار نہیں ہے وچارہ۔ میرے کان سڑ جائیں جو سارا دن کبھی اس کی چوں بھی سنی ہو، گلی میں بے شک بڑھکیں مارتا پھرے۔''

''میں تو اس کرموں جلی کا سوچ رہی ہوں جو بختاں کی ''نوں'' (بہو) بن کے اس کے ویہڑے آ رہی ہے۔'' نصیبن نے سرد آہ بھری۔

''ہائے ہائے، کی حال ہون والا ہے اس وچاری کا۔ بختا کو کون نئیں جانتا۔ پتا نئیں کیسے ماں پیو تھے جنہوں نے دھی ڈائن کے چنگل میں دے دی۔''

''مجھے تو لگتا ہے ماں پیو ہوں گے ہی نئیں۔'' مائی رجی نے قیاس ظاہر کیا ''یا پھر ''متریے'' (سوتیلے) ہوں گے۔ کچ بتایا بھی تو نئیں بختاں نے...... کہ کہاں رشتہ جوڑا ہے پتر کا۔ بس اتنا بتایا ہے کہ پاک پتن اور کنگن پور کے بیچ میں پڑتا ہے وہ پنڈ، جہاں کی کڑی اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ ھورے برادری کی ہے؟''

''برادری والے منہ ہی کب لگاتے ہیں اسے۔ سولہ سال ہو گئے ہیں بختاں کو اس محلے میں رہتے۔ ہم میں سے کسی نے تو نہ دیکھا اس کے کسی رشتے دار کو کبھی اس کے گھر آتے جاتے۔ یہ تو لگتا ہے درخت پہ اگی تھی نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ یہ ماجھو تھا کوئی دس گیارہ سال کا اس کی انگلی پکڑی ہوئی تھی اور ریہڑے پہ تھوڑے سے ٹوٹے ہوئے سامان کے ساتھ ایک بیمار سا سوکھا سڑا، ٹی بی اور دمے کا مارا بابا تھا۔ میں تو اسے بختاں کا پیو سمجھتی تھی، اس محلے میں آنے کے تیسرے دن جب وہ بابا مرا تو پتہ چلا کہ بھئی یہ تو اس زنانی کا خصم تھا۔ اب بھی دم خم کم تو نئیں بختاں کا مگر سولہ سال پہلے تو دیکھنے والی چیز تھی۔ اوچی لمبی، ہٹی کٹی، چار مردوں کی ٹکر کی زنانی تھی۔ آتے ہی پورے جگن پورے میں راج کرنے لگی۔ اس سے لڑ، اس سے بھڑ، مار کٹائی کا تو چسکا پڑا تھا۔ آج تک وہی حال ہے۔''

''مائی رجی صئی کہ رہی ہے۔ ''نوں'' کو کدر بخشنے والی ہے یہ...... مار مار کے چار دنوں میں نکال باہر کرے گی۔ ماجھے کے بارے میں تو ویسے ہی بڑا چھوٹا حوصلہ ہے اس کا۔ وچارے کو بچپن، لڑکپن میں کسی یار دوست تک کے ساتھ تو کھیلنے نہ دیتی تھی...... ووھٹی کے ساتھ کیسے......'' چھمو بڑی سنجیدگی اور رنجیدگی سے بات کرتے کرتے اچانک منہ پہ ہاتھ رکھ کے کھلکھلا اٹھی۔ نصیبن اور پاس کھڑی دو چار عورتوں نے اس ٹھٹھے میں اس کا ساتھ دیا۔ مائی رجی کو شاید واقعی اس ان دیکھی دلہن سے ہمدردی ہو رہی تھی اس لیے وہ اب تک افسوس سے اپنا رعشہ زدہ سر اور زور زور سے ہلا رہی تھی۔

☆

آج اس کے اکلوتے بیٹے کی برات نکل رہی تھی، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ آج تو اس کے ''ٹھیکے'' دیکھنے لائق تھے۔ سوہے رنگ کا ریشمی جوڑا اس کے پھیلے ہوئے وجود پہ پھنسا ہوا تھا۔ گوٹے ٹکا سوہا دوپٹہ......

سر پہ جو گنتی کے بال رہ گئے تھے۔ انہیں کالا سیاہ رنگ کے چنبیلی کا تیل لپ لپ ڈال کے باریک سی گت کر رکھی تھی۔ بھرے ہوئے رخساروں والے چوڑے چہرے اور موٹی سی اڑھائی انچ کی گردن پہ خوب پاؤڈر تھپا تھا۔ پھولے ہوئے ہونٹوں پر تیز رنگ کی سرخی رگڑ کے ملی گئی تھی، کچھ کچھ اس کے پان سے تباہ ہوئے دانتوں تک پہ لگی ہوئی تھی۔ اندر کو دھنسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سرمے کی دھاریوں سے سج کے اور بھی مکار و عیار لگ رہی تھی۔ کانوں میں سونے کی موٹی موٹی بالیاں ایک کلائی میں کانچ کی سرخ چوڑیاں تو دوسری کلائی میں سونے کا پانی چڑھایا ہوا پیتل کا بھاری کڑا پھنسا رکھا تھا۔ ہاتھوں پیروں پہ مہندی کوئی نئی بات نہیں تھی وہ تو ہمیشہ ہی بہار دکھاتی رہتی تھی۔ رنگ تو اس کا یوں بھی سانولا تھا لیکن ہاتھ پیر کالے سیاہ تھے۔ اس پہ اسے ہمہ وقت ہتھیلیاں اور تلوے مہندی سے رنگے رکھنے کا شوق تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے ہاتھ اوپر سے جتنے بھیانک کالے تھے، الٹی طرف سے اتنے ہی اجلے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہتھیلیاں اور تلوے اتنے صاف نہ ہوں لیکن ہاتھ پیروں کی سیاہی کے آگے ان کی سفیدی زیادہ ابھر آتی ہو...... بالکل ایسے ہی جیسے ان گوری ہتھیلیوں کے پلٹتے ہی ہاتھ کی کالک زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی اسی لیے وہ اس سیاہی سفیدی کو مہندی کی لالی سے ڈھک کے رکھتی تھی۔

آج ماجھو بھی بوسکی کا کُرتہ، سفید لٹھے کی شلوار اور سیاہ واسکٹ میں بڑا اکڑ کے بیٹھا تھا۔ قسمت کی بات تھی کہ ہر وقت کیچڑ اور گٹر کے پانی سے بھری رہنے والی گلی پچھلے سارے ہفتے کی کڑاکے کی دھوپ لگنے سے سوکھی پڑی تھی۔ بارش تو خیر دو مہینے سے نہ ہوئی تھی، حیرت کا مقام یہ تھا کہ گٹر بھی پچھلے کئی دنوں سے نہ ابلے تھے۔ گلی ایک طرف سے ویسے ہی بند تھی، دوسری جانب قنات لگا کے بند کی گئی وہیں سہرا بندی کی رسم ادا ہو رہی تھی، بینڈ باجے والے ''دیساں دا راجا'' کی دُھن بجا بجا کے بے حال ہو رہے تھے۔ پورے محلے کے ہر گھر سے ایک ایک بندے کو برات کی دعوت دی گئی تھی البتہ ولیمے کے لیے ہر گھر سے دو دو بندوں کا دعوت نامہ تھا۔ گرمی کا موسم، حبس کا عالم...... اوپر سے برات جانی بھی خاصی دور تھی۔ چند شوخے لڑکوں کے علاوہ کسی نے برات کے ساتھ جانے کی ہمت نہ کی۔

''کون شکر دوپہر ویلے نکلنے والی جنج کے ساتھ جائے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ لاکھ لڑاکا ہونے کے باوجود بختاں محلے کے ہر گھر میں شادی بیاہ پہ روپے پیسے بھگت چکی ہے۔ اب اس کے اکلوتے بیٹے کی خوشی ہے، ہم سب کا ''ورتنا'' (نیوتا) لازمی ہے لیکن ادھر سہرا بندی پہ ہی فارغ ہو جاتے ہیں۔ کل ولیمہ دیکھا جائے گا۔''

یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا۔ بچے کچھ تو بینڈ باجے والوں کے آگے کھڑے خواہ مخواہ ناچے جا رہے تھے، کچھ ماجھے کے دوستوں کے پھینکے جانے والے سکے لوٹ رہے تھے۔ بڑی بوڑھیاں سو، پچاس کے نوٹ سہرا باندھے بیٹھے ماجھے کے ہاتھ پہ دھر رہی تھیں اور بہو بیٹیاں، لڑکیاں بالیاں، چھتوں سے لٹک کے نظارے کر

رہی تھیں۔ ماجھے کے شوخے دوست ٹپاخے پھوڑ کے اور بھنگڑے ڈال کے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور بختاں بنی سنوری، بڑے ٹھسے کے ساتھ بیٹے کے برابر والی کرسی پر مدبر سی شکل بنانے کی کوشش کرتی، بیٹے کے ہاتھ پر رکھے جانیوالے نوٹ مسلسل اپنے پھولے ہوئے بٹوے میں منتقل کرتی جارہی تھی۔

اللہ اللہ کر کے برات نکلی۔

تپتی ہوئی منڈیروں سے چپکی عورتوں نے شکرادا کیا اور اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کرنے جمع ہوگئیں۔

''شوھدے ماجھے پہ لاڑھے (دولھے) والا روپ تو چڑھا ہی نہ تھا'' نذیراں کو ماجھے سے شروع سے ہی خار تھی، بچپن سے وہ سال میں ایک دو بار اس کے بیٹے نکو کا سر پھوڑتا آرہا تھا ''منحوس، لعنتی شکل لگ رہی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کوئی نشہ وشہ کرنے لگ گیا ہے۔''

''جن کو زیادہ دبا کے رکھو ہاتھ ڈھیلا کرنے پہ وہ ایسے ہی ''اتھرے'' ثابت ہوتے ہیں۔ ساری حیاتی بختاں نے اسے دبوچ کر رکھا۔ ستائی سال کا مرد اب بھلا قابو آتا ہے اس کے۔ یہی بوھت ہے کہ ماں کے آگے اب بھی دب کے رہتا ہے۔ اچی نئیں بولتا لیکن وہ بات اب نئیں رہی کہ ماں کی جھڑکیاں کھا کے پچھلی کوٹھڑی میں دبک کے بیٹھا رہے۔ پچھلے سال سے اس کے رنگ ڈھنگ بدل رہے ہیں۔ نئے نئے یار دوست بنا لیے ہیں، دن بھر خوار ہوتا رہتا ہے رات بھی دیر سے آتا ہے۔''

''سب بختاں کی مرضی سے ہوا ہے ماسی۔'' چھمو نے بتایا ''بڑی سیانی زن (عورت) ہے۔ پتا ہے ناں کہ اب پتر کی گھٹی میں ماں پڑگئی ہے چاہے بھی تو پچھا نئیں چھڑا سکتی۔ اس لیے خود سکھا پڑھا کے تیز کر رہی ہے وہ بدلا ضرور ہے مگر اوروں کے لیے، ماں کے لیے اب بھی وہی ڈرا سہا، مارکٹ کھانے والا ماجھو ہے۔ ھور سے چوری چکاری کرتا ہے جوا کھیلتا ہے مگر روز رات کو ماں کے ہاتھ پہ چنگی تگڑی رقماں رکھتا ہے۔ دیکھ نئیں رہی یہ نئے نکور سونے کے بالے، بری میں بھی سونے کا سیٹ چڑھایا ہے پورے سات ریشمی کام والے جوڑے اور چاندی کی پازیب۔ اس نے خود تربیت ہی بیٹے کی بدمعاشوں والی کی ہے۔ مسٹنڈا پال کے محلے میں چھوڑ دیا ہے۔''

''مجھے تو رہ رہ کے اس نمانی کا خیال آرہا ہے۔ بختاں نے بنائی تو ہے بری...... سونے کا سیٹ، ٹیکا سات جھلمل جوڑے...... لیکن قربانی کے بکرے کو بھی لوگ ہار بندے سے سجاتے ہی ہیں، مجھے تو نئیں لگتا کہ وچاری کو یہ سات جوڑے پہننے بھی نصیب ہوں گے یا تو خود مار ڈالے گی گلا دبا کے یا بیٹے کے ہاتھوں مرو ڈالے گی۔ اس کا گزارہ ہے کوئی کسی دوجے کے ساتھ...... ناں جی۔'' نصیبن نے پیش گوئی کر دی جسے جھٹلا... کی زحمت کرنا کسی نے گوارا نہ کی۔

☆

اوور دوھٹی آ گئی۔ دن کے دس ساڑھے دس بجے برات نکلی تھی، رات کے نو بجے واپس آئی۔ محلے...

ساری عورتیں مارے اشتیاق کے بختاں کے چار فٹ چوڑے ویہڑے میں جمع ہوگئیں۔ بختاں بڑے فخریہ انداز میں اپنے گھر کے اکلوتے مکمل کمرے میں بچھے رنگلے پلنگ پر نئی نویلی دلہن لیے بیٹھی تھی۔

''نوں تو رج کے سوہنی ڈھونڈی ہے نی بختاں۔''

'مائی رجی نے بغیر کسی بناوٹ کے کہا۔ واقعی دلہن خاصی کم عمر، بھولی بھالی سی لگ رہی تھی۔ یہی کوئی پندرہ سولہ کا سن، کھلتی گندمی رنگت، کھڑے نقوش اور سب سے بڑھ کے گول سے چہرے سے ٹپکتی معصومیت۔

''ہائے ہائے...... بڑا ظلم ہے بھئی۔'' وہاں سے نکلتے ہی سب کے تبصرے تبدیل ہو گئے۔ اب دلہن کی تعریف کے بجائے اس پہ افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔

''نکی جئی کڑی اے۔'' چھمو نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

''بختاں کی تو اِک ''برکی'' (لقمہ) ہے یہ۔ پتا بھی نئیں چلنا اور بغیر ڈکار کے نگل لے گی۔ وچاری یتیم مسکین بچی۔''

☆

سب کو اپنے اپنے اندازوں کی درستگی پہ ایمان کی حد تک یقین تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ بختاں مروتاً یا دنیا دکھاوے کی خاطر بھی چند دن نئی دلہن کا لحاظ نہ کرے گی ہوسکتا ہے ولیمے پہ ہی محلے والوں کو یہ نظارہ دیکھنے کو ملے کہ نئی دلن کی چوٹی بختاں کے ہاتھ میں ہے، بے چاری کا بھولا بھالا چہرہ اس کے اڑھائی اڑھائی کلو والے ہاتھ کے کرارے تھپڑوں کی زد میں ہے، اس کی نازک سی کمریا پہ اس کے وحشیانہ ٹھڈے پڑ رہے ہیں اور ''ماجھو ایک کونے میں دبکا بے بسی سے دیکھ رہا ہے۔

لیکن ہوا کیا...... کہ جگن پورے کی تماش بین عورتوں کو تماشہ تو دیکھنے کو ملا مگر جو وہ سوچ کے آئی تھیں ویسا نہیں۔ ابھی ولیمے کی روٹی کھلی ہی تھی کہ شور مچ گیا۔ ایسے پسماندہ محلوں کی شادیوں میں روٹی لگنے پہ شور ہونا اور بھگدڑ مچ جانا معمول کی بات تھی اس لیے کسی نے خاص کان نہ دھرا۔ سب کو اپنی اپنی پلیٹیں زردے اور قورمے سے بھرنے کی فکر تھی۔ وہ تو جب ماجھے کے چند دوستوں کو بگٹٹ بھاگتے دیکھا تو چند ایک کا ماتھا ٹھنکا۔ ولیمے کا کھانا چھت پہ قنات لگا کے کھلایا جا رہا تھا۔ بختاں کی چھت پہ مردوں کو......اور چھمو کی چھت پہ عورتوں کو۔ کوئی تھا جسے قورمہ ختم ہو جانے کی پروا نہ تھی اس نے کھانے سے توجہ ہٹا کے ذرا کی ذرا نیچے گلی میں گردن لٹکا کے دیکھا۔

''اوئے پُلس (پولیس) ساڈے محلے پُلس آئی۔'' اس کے اعلان پہ اکثر نے نوالہ روک کے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''اوئے پُلس نے ماجھے کو پھڑ (پکڑ) لیا۔'' اگلی آواز میں کیسا زردہ اور کیسا قورمہ...... س ۔ی خلقت

یہ نظارہ دیکھنے سٹیل کی پلیٹیں چمچے پرے پھینک کے نیچے بھاگی۔ پولیس والے ماجھے اور اس کے دو دوستوں کو گردن سے دبوچ کے وین میں ڈالنے کے بعد لے جا چکے تھے۔ چند لوگوں کے گھیرے میں غصے سے تلملاتی، بپھرئی ہوئی بختاں منہ سے کف اڑاتی پولیس والوں کی ماں بہن ایک کر رہی تھی۔ اس کی گالیاں سن کے گلی کے کچی عمر کے لڑکے بالے ایک دوجے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے کھی کھی کر رہے تھے۔ اس پہ بھڑاس نہ نکلی تو وہ گلی میں پڑے پتھر اور ٹوٹی اینٹیں اٹھا اٹھا کر اس طرف پھینکنے لگی جس طرف پولیس کی گاڑی گئی تھی۔ آگے سے آتے لوگ ہڑ بڑا کے ہٹے، گلی تھی کتنی چوڑی کئی ایک دو تو ٹخنوں، گھٹنوں پہ پتھر لگنے سے بلبلا بھی اٹھے۔

''ارے دماغ پھر گیا ہے کیا اس کا؟ بیٹا پولیس لے کے گئی ہے پتھر ہم بے قصوروں کو مار رہی ہے۔ اوئے ہم تو ہمدردی کرنے آئے تھے۔''

اس کا دھاری دار ہرا اور نارنجی دوپٹہ نیچے مٹی میں رُل رہا تھا۔ کتنے شوق سے اس نے گہرے گہرے شوخ رنگوں کے کپڑے بنوائے تھے، لوگوں کو دکھانے کے لیے اور لوگ دیکھ تو رہے تھے...... کیسے وہ اپنا تماشہ بنا رہی تھی۔ چھ چھ مرد اس بپھری ہوئی ادھیڑ عمر عورت کو قابو کرنے کی کوششیں کر رہے تھے جو چنگھاڑ رہی تھی۔ اس کی تلے والی چپل اس کے مہندی رنگے پیروں سے نکل چکی تھی۔ تنگ قمیص کے دو بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ جب چیخ چیخ کے اس کا گلا بیٹھ گیا اور گالیوں کا سارا سٹاک بھی ختم ہو گیا تو وہ بے دم سی ہو کے نیچے گر گئی۔ مضبوطی سے اس کے بازو دبوچے ہوئے لوگوں نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اب وہ گلی میں بیٹھی سینہ کوٹ کوٹ کر بین کر رہی تھی۔

ماجھے نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ڈکیتی کی کوئی واردات کی تھی۔ کچے ڈکیت تھے اس لیے چار دن بعد ہی دھر لیے تھے۔ شادی کی ساری شوشا اور بری کی رونقیں اسی ڈکیتی کی مرہون منت تھیں مگر بے چارہ ابھی جی بھر کے سیر ہی نہ ہوا تھا حرام کی کمائی سے کہ وہ حلق میں پھنس گئی۔

''اب کیا سیاپا ڈال کے بیٹھی ہے پہلے اولاد قابو میں کر کے رکھنی تھی۔'' مائی رجی نے اپنی بزرگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھرکا۔

''چھڈ مائی، اس کا کیا گیا؟ نصیب تو اس شوہدی کے پھوٹے ہیں جس نے ابھی کل اپنی زندگی شروع کی تھی۔ وہ تو سمجھو شادی کے اگلے دن ہی اُجڑ گئی۔ ہورے اب ماجھو کتنے سال کے لیے اندر ہوا ہے۔'' کسی نے سب کی توجہ اس لڑکی کی جانب دلائی جو اس سارے ہنگامے سے الگ مکان کے پچھلے کمرے میں گھونگھٹ ڈالے بیٹھی تھی اور جو یقیناً اب تک اس قصے سے انجان نہیں رہی ہو گی۔ کسی نہ کسی ہمدرد نے اندر تک یہ خبر پہنچا ہی دی ہو گی۔ اس کا دھیان آتے ہی بختاں بھوکی شیرنی کی طرح اٹھی اور اندر کی جانب لپکی۔ اس کا انداز دیکھ کے سب بھانپ گئے کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ کئی عورتیں اس کے پیچھے گئیں لیکن تب تک وہ اپنی نئی

نویلی فقط ایک دن پرانی بہو کو دبوچ چکی تھی۔

''منوس، حرام خور...... کالے بوتھے والی۔'' وہ تابڑ توڑ تھپڑ اس کے منہ پہ مارتی جا رہی تھی۔ مارے دہشت کے دلہن بے چاری مزاحمت کرنا تو دور کی بات، چیخنا چلانا تک بھول گئی تھی۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ساس کا وحشیانہ روپ دیکھ رہی تھی۔ کچھ عورتوں نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ روکنے چاہے مگر اس نے ایک جھٹکے سے اگلے ہی لمحے خود کو چھڑا لیا۔ دلہن نے عقل سے کام لیتے ہوئے اپنا منہ دونوں بازوؤں کے حلقے میں چھپا کے سر گھٹنوں میں کر لیا۔ اب بختاں کے دھموکے اس کی نازک سی کمر پہ بج رہے تھے۔ عورتیں توبہ توبہ کر رہی تھیں۔

''دفع ہو جا منوس شکل والیے...... تیرے نیش قدم پڑتے ہی میرا پتر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔''

اتنے تشدد کو وہ بے چاری سہہ نہ سکی اور بے ہوش ہو کے ایک جانب لڑھک گئی۔

''بس کر بختاں، جان لے گی کیا نمانی کی۔ بے ہوش ہو چکی ہے۔'' کسی کی آواز پہ اس نے ہاتھ روکے اور لمبے لمبے سانس لیتی اسی پلنگ پہ گر گئی۔ سجے سجائے عروسی کمرے میں اس وقت محلے کی کم از کم آٹھ عورتیں بھری ہوئی تھیں لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی آگے بڑھ کے بے ہوش دلہن کو دیکھنے کی۔ ایک نے لال بھبھوکا بختاں کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا گلاس پکڑا دیا۔ وہ فٹافٹ منہ سے لگا گئی۔ یونہی پیتے پیتے کن اکھیوں سے اپنے ساتھ آڑی ترچھی پڑی بہو کو دیکھا تو وہ ہاتھ وہیں کا وہیں رہا...... گلاس لبوں سے لگا رہ گیا مگر پانی پینا بھول گئی۔

آتشی گلابی بھاری کام والا دوپٹہ آدھا سر پر پنوں کی وجہ سے ٹکا رہ گیا تھا اور آدھا اس کے نیچے دبا تھا، ایک پلو پلنگ سے لٹک کے فرش کو چھو رہا تھا۔ ایک ٹانگ نیچے جھول رہی تھی جبکہ دوسری آڑی ترچھی سی ہوئی پڑی تھی۔ کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ کے بستر پہ پھیلی تھی، کچھ کرچیاں لگنے سے کلائی سے خون بھی رس رہا تھا۔ ماتھے کا ٹیکا اتر کے دور جا گرا تھا۔ سر کے بال بری طرح بکھرے تھے، ہونٹ اوپر سے پھٹ چکا تھا اور سوج کے دگنا ہو رہا تھا۔ بے ہوشی کے عالم میں بھی اس کے ادھ کھلے زخمی ہونٹوں سے ٹوٹی ٹوٹی سسکیاں آزاد ہو رہی تھیں۔ آنسو پلکوں سے سارا کاجل اور مسکارا بہا کے رخساروں پہ چھپے بختاں کی انگلیوں کے نشانات کو سیاہ کر رہے تھے۔

بختاں کا گلاس والا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس نے پیتل کے اس بڑے سے گلاس میں ڈبوئیں اور پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پہ مارنے لگی۔ وہ ذرا سا کسمسائی۔ عورتیں معنی خیز انداز میں اِک دوجے کا منہ دیکھنے لگیں۔ اب بختاں اپنا گیلا ہاتھ اس کے چہرے پہ پھیر رہی تھی...... اس کے ہونٹ سے نکلتا خون دوپٹے کے بھیگے ہوئے پلو سے صاف کر رہی تھی۔ اس کے سوجے ہوئے سرخ رخساروں سے بال پیچھے کرتی ہوئی بختاں کی آنکھوں میں آنسو سب کے لیے ایک نئی چیز تھی اور حیرت انگیز بھی۔

"ماں صدقے جائے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ہوش میں آتی بہو کا سر اٹھا کے اپنی گود میں رکھ لیا۔ اسی لمحے اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے اتنے قریب ساس کا چہرہ پا کے وہی دہشت اس پہ ایک بار پھر طاری ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ مار کے دوبارہ بے ہوش ہو جاتی، بختاں نے جھک کے اس کا ماتھا چوم لیا۔ اب تو محلے کی عورتوں کی باری تھی بے ہوش ہونے کی۔

"میری ارمانوں سے لائی نوں...... وچاری کی کوئی عمر ہے یہ غم دیکھنے کی۔ ابھی تو مہندی کی خوشبو باقی ہے اس کے ہاتھوں میں...... ابھی تو مانگ کی افشاں بھی نہیں چھوٹی...... ہائے کوئی عمر ہے!" وہ آنکھوں پہ دوپٹہ رکھ کے رونے لگی، آس پاس کھڑی سبھی عورتوں کی آنکھیں بھر آئیں وہ جانتی تھیں، بختاں ڈرامہ نہیں کر رہی۔ اس نے کبھی ڈرامہ کیا بھی نہ تھا...... وہ جیسی تھی بری بھلی، بدمزاج، لڑاکا، ہتھ چھٹ...... اس نے کبھی خود پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہی نہ تھی۔ کبھی جھوٹے رونے نہ روئے تھے، کبھی نقلی محبت یا مصلحتاً اخلاق نہ جتایا تھا۔ اس لیے آج اس کے یہ آنسو سچے تھے۔ ماجھو کی دلہن رانی کا دل بھی موم ہو گیا۔ اس کے دل سے اس چھ فٹ لمبی تڑنگی، کالی مردقسم مار کی عورت کی دہشت یکا یک ختم ہوگئی۔ اس نے نرم حنائی ہاتھوں سے بختاں کے ہاتھ تھام لیے۔

"اماں بس کر...... اماں چپ ہو جا۔"

"ہائے...... ماں صدقے جائے۔" بختاں نے اسے گلے لگا لیا۔

☆

اگلے آٹھ مہینے پورے جگن پورہ محلے کے لیے بڑے حیرت انگیز تھے۔ وہ بختاں جس کی سخت دلی اور گرم مزاجی گزشتہ سولہ سالوں سے محلے والوں کے لیے ایک معمول کی چیز تھی، اس کی رانی کے لیے لگاوٹ اور نرمی یقیناً غیر معمولی بات تھی۔

رانی جس نے ہوش سنبھالتے ہی یتیمی۔ غربت، بھوک اور نفرت کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا وہ اب سچ مچ کی رانی کہلانے لگی، کھانے کو اچھا ملنے لگا...... اوڑھنے کو اچھا ملنے لگا۔ گھر کے کام بھی خاص نہ تھے، بختاں جس اسکول میں آیا گیری کرتی تھی وہاں سے اڑھائی بجے واپس آنے کے بعد گھر کے بھی کئی کام کر دیتی ورنہ دن کو جی چاہتا تو رانی ہانڈی روٹی کر لیتی...... جھاڑو پھیر لیتی۔ دو لوگوں کا کام ہی کتنا ہوتا ہے۔

"چھمو اب بھی دن میں کتنی بار دیوار سے کان لگا کے کھڑی ہوتی...... شاید بختاں کی کوئی ڈانٹ پھٹکار، کوئی دل جلے کو سنے رانی کو مل رہے ہوں مگر وہاں سے اکثر یہ آوازیں سنائی دیتیں۔

"نئی رانیئے، گڑ والے چاول بنالوں، جی چاہ رہا ہے؟"

"رانی دھیئے ایسی اجاڑ نہ پھرا کر، نی کوئی ہار سنگھار کر۔"

''چل آ تجھے انارکلی لے چلوں۔ بڑی گرمی اے اپنے لیے دو جوڑے ململ کے پسند کر لے۔''
کبھی وہ اچک کے دیکھنے کی کوشش کرتی تو یہ نظارے دیکھنے کو ملتے۔ بختاں اونچی پیڑھی پہ بیٹھی رانی کے لمبے بالوں میں کڑوا تیل مل رہی ہے اور کچے فرش پہ پھسکڑا مارے بیٹھی رانی آنکھیں موندے مالش کے مزے لے رہی ہے۔ کبھی وہ دونوں کو ایک تھالی میں سے مونگ پھلیاں پھانکتے اور گپیں لگاتے دیکھتی۔
مائی رجی نے ایک بار ہمت کر کے پوچھ لیا ''بختاں نوں کے ساتھ تو تیرا بڑا بھیل پنا (دوستی) ہو گیا ہے، خیر تو ہے؟''
''مائی ہم دونوں کا ایک دوجے کے سوا اور ہے ہی کون! خیر وہ کڑی تو ہے بھی بڑی بھلی مانس۔ اس کے ساتھ بیر رکھ کے مجھے کیا لینا ہے۔ بیر تو قدرت نے اس کے ساتھ کیا ہے اس وچاری کی کوئی عمر ہے یہ سب دیکھنے کی۔'' اس کی آواز کپکپا گئی۔
''مائی ر تجھے کیا پتا، چھوٹی عمر کے دکھ بڑی تکلیف دیتے ہیں۔ نئی نئی شادی کے بعد ملنے والے نئے نئے دھکے اندر تک ہلا کے رکھ دیتے ہیں اوپر سے اگر پیکہ (میکہ) بھی نہ ہو، ماں پیو بھی مرکھپ گئے ہوں، دکھ درد بانٹنے والے بھی نہ ہوں، سر کا سائیں بھی چھاں (سایہ) دینے کے بجائے لو برسانے والا ہو، سکھ کے بجائے اتھرو (آنسو) تحفے میں دے تو تجھے کیا پتا مائی...... تجھے کیا پتا۔''

☆

آٹھ مہینے بعد پتا نہیں کیسے ماجھو رہا ہو گیا۔ ڈکیتی کے مال میں سے ابھی بیس فیصد بھی چاروں یاروں سے خرچ نہ ہوا تھا باقی مک مکا کرنے کے کام آ گیا۔ ماجھے کی ساری اکڑ ہوا ہو چکی تھی۔ تھانے میں ہونے والی ٹھکائی اور دھلائی نے اسے آدھا کر کے رکھ دیا تھا۔ اب وہ محلے میں گردن اکڑا کے نہیں بلکہ سر جھکا کے چلتا تھا۔ بختاں کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ روز اس کے گھر سے نئے نئے پکوان بننے کی خوشبوئیں آنے لگیں۔ کچھ روز گزرے کہ اس کے گھر سے نئے نئے جھگڑوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔
اب چھمو دیوار سے کان لگاتی تو کچھ اس قسم کی آوازیں سنائی دیتیں ''رانی کچھ حیا کر، دن چڑھے کتنی دیر ہو گئی اور تو اب تک کمرہ بند کیے خصم کی بغل میں بیٹھی ہے، نکل باہر۔ میں بڈھی جان تم دونوں کی چاکری کے لیے رہ گئی ہوں کیا! یہ ڈھونگی زنانی سرخی پوڈر لگ کے سج بن کے بیٹھ جاتی ہے۔ میں پکاؤں اور تم دنوں لاڑھا دوھٹی (دولہا دلہن) کے آگے رکھوں۔ کان کھول کے سن لے رانیئے بڑا آرام ہو گیا چل اپنا گھر سنبھال۔''
''ماجھے تیری تو عقل ماری گئی ہے۔ ایسا زنانی کے پیچھے پاگل ہوا ہے کہ نہ ماں یاد رہی ہے نہ کام کاج۔ تو تو لگتا ہے ترسا بیٹھا تھا، سارا دن اس منوس کے گوڈے سے لگا رہے گا تو روپیہ پیسہ کیا چھت سے برسے گا؟ چھوڑ اس عاشقی معشوقی کو اور اسی کام پر لگ یہ زنانی تو تجھے کسی جوگا نہیں چھوڑے گی۔''

کبھی جو چھمو اچک کے دیکھتی تو ماجھو منجی پہ بیٹھا روٹی کھا رہا ہوتا۔ رانی اسے پانی کا گلاس پکڑاتی اور وہ شرارت سے گلاس کے ساتھ ساتھ اس کا مکھن ملائی جیسا ہاتھ بھی تھام لیتا اور ذرا پرے بیٹھی بختاں جس کی ساری توجہ ان دونوں پہ ہوتی بپھر کے اٹھتی اور ماجھو کے آگے پڑے ٹرے الٹانے کے بعد رانی کی چٹیا پکڑ کے خوب خوب جھٹکے لگاتی۔

کبھی رانی کو دیوار سے لگے شیشے کے آگے کھڑے ہو کر لٹ میں بل ڈالتے دیکھ لیتی...... یا سرخی ملتے دیکھ لیتی تو دو ہتڑوں کے ساتھ بیچاری کی پسلیاں تک ہلا ڈالتی اور ایسے میں اگر قسمت کا مارا ماجھو اسے چھڑانے آگے بڑھتا یا اس کی طرف داری میں آدھا حرف تک منہ سے نکال بیٹھتا تو صرف چھمو ہی نہیں ساری گلی رانی کا حشر ہوتے دیکھ لیتی کیونکہ زیادہ طیش میں آنے کے بعد بختاں کو اڑھائی مرلے کا مکان چھوٹا پڑنے لگتا تھا، وہ رانی کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آتی اور آتے جاتے لوگوں کے ساتھ ساتھ چھتوں پر چڑھی فارغ عورتیں بھی اس کی پٹائی کا نظارہ کرتیں۔

ایک دو بار اس قسم کی ہمدردی دکھانے کے بعد ماجھو نے توبہ کر لی۔ اب وہ بڑے مزے سے سیٹی بجاتا ہوا مار کھاتی، روتی، کرلاتی رانی کے پاس سے گزر کر چلا جاتا۔ ویسے بھی تھانے میں لگنے والے زخم بھر چکے تھے، مار کے بھی اور بے عزتی کے بھی وہ اپنی اوقات سے زیادہ شرمندگی دکھا چکا تھا۔ اس کے یار دوست پھر اسے گھیرے میں لینے لگے تھے۔ پہلے جو تھوڑی بہت گرفت بختاں کی اس پر تھی، اب وہ بھی نہ رہی۔ ایک تو وہ جیل کی ہوا کھا چکا تھا اس کے دیدوں کا پانی مر گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ بختاں کو طبع آزمائی کے لیے رانی کافی تھی۔ اس کی توجہ بیٹے سے کیا ہٹی کہ وہ برائی کے رستے پہ آگے بڑھتا ہی گیا۔ چوری چکاری تو وہ پہلے ہی کرتا تھا اب باقاعدہ کسی جرائم پیشہ گروہ سے وابستہ ہو چکا تھا۔ جوا کھیلنے کی لت بھی کب سے پڑ چکی تھی، اب شراب، چرس اور افیم کا شوق بھی ہو گیا۔ نشے نے اس کی رہی سہی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی سلب کر لیں۔ اس کی تمام حسیات بے جان ہو گئیں اور ہر جذبہ مر گیا۔ اب رفتہ رفتہ وہ انسان سے حیوان بننے کے مراحل طے کر رہا تھا۔

تھانے سے آنے کے بعد جو چند دن اس نے گھر پہ ٹک کے گزارے۔ ان دنوں میں پندرہ سولہ سال کی الھڑ جوان دلہن نے اس کا دل کافی موم کر دیا تھا اس کی قربت اسے بہکانے لگی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس نشے پہ شراب اور چرس کا نشہ غالب آ گیا۔ محبت کے جذبے پہ حرص اور ہوس کا جذبہ ہو گیا۔ رانی اب اس کے نزدیک کشش کھونے لگی تھی۔

☆

”بڑے دن ہو گئے، جگن پورے میں کوئی جنج اتری نہ چڑھی۔“ نصیبن نے کہا۔

”نی جب سے بختاں نے پتر ویایا ہے۔ لوگ اس محلے میں کڑی دینے سے ڈرنے لگے ہیں۔ توبہ

توبہ...... بڑی بڑی ڈاڈی اور کپتی (سخت گیر) ساسیں دیکھی ہیں مگر بختاں جیسی جلاد نہیں۔ میں نہ کہتی تھی کہ رانی بے چاری اس کی ایک بر کی (لقمہ) کے برابر ہے۔''

''لیکن پہلاں پہل تو بختاں بڑی سیدھی بنی رہی۔ رانی کے ایسے لاڈ اٹھاتی تھی جیسے......''

اچانک گلی میں شور سا مچا۔ وہ ساری جو مائی رجی کے گھر کے کچے ویہڑے میں اس کے بڑے سے پلنگ پہ بیٹھی ''گندلیں'' (سرسوں کا ساگ) بنا رہی تھیں۔ مارے اشتیاق اور ہڑبڑاہٹ کے ایک دوسرے کے اوپر گرتی باہر کی طرف بھاگیں۔

''رانی کو کُٹ پڑ رہی ہے۔'' مائی رجی کی بڑی پوتی شکیلہ جو پہلے سے دروازے پر کھڑی تھی، اس نے پلٹ کر بتایا تو ساروں کا اشتیاق اور تجسس جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''لے...... یہ کون سی نئی گل اے۔ یہ تو روز کا تماشا ہے۔ دفع دور۔ بختاں کو تو اور کوئی کام ہی نہیں اور یہ رانی، بے حیا، اتنی مار کھانے کے بعد بھی مرتی نہیں۔ بڑی ڈھیٹ ہے۔''

''نئی گل یہ ہے ماسی کہ آج رانی کو ماسی بختاں سے نہیں اس کے بندے ماجھے سے مار پڑ رہی ہے'' شکیلہ نے معلومات میں اضافہ کیا۔ واپس پلٹتی عورتیں دوبارہ باہر لپکیں۔

رانی پورے دنوں سے تھی، اس کا دوپٹے سے بے نیاز وجود اپنا اعلان پکار پکار کے کر رہا تھا۔ کیچڑ سے بھری گلی میں وہ اس طرح اوندھی پڑی تھی کہ اس کی شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے کہیں اوپر اٹھ چکے تھے، پشت سے قمیص ہٹ چکی تھی اور دودھیا کمر جھلک رہی تھی لیکن وہ اپنی عریانیت چھپانے کی کوشش کرنے کی بجائے پوری طرح زمین پر جھکی اپنے پیٹ کو اس کے اندھا دھند اٹھتے پیروں اور ہاتھوں کے وار سے بچانے کی تگ ودو کر رہی تھی۔

''زبان چلنے لگی ہے اس گونگی کی بھی...... میرے آگے منہ کھولتی ہے دو ٹکے کی زنانی۔'' ہاتھوں پیروں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی اسے بخشنے پہ تیار نہ تھی۔

''اس گھر سے نکل کر تیرا اور ٹھکانہ ہے کیا؟ پھر کس لیے اتنا اکڑ دکھا رہی ہے میں نے ہی ڈالا ہے ناں یہ زیور...... پھر اگر میں نے ہی مانگ لیے تو تڑپ کیوں رہی ہے...... تیرے پچھلوں نے چاندی کی تار تک نہ ڈالی تھی، تیری اوقات ہی کہاں تھی اس زیور کو پہننے کی۔ لا، دے مجھے۔ وہ وحشیوں کی طرح اس کے کانوں سے جھمکے نوچنے لگا۔ وہ پورا حلق پھاڑ کے چلا رہی تھی۔

''وے ماجھو'' بند گلی میں اک رش پڑا تھا جب گلی کے دوسرے سرے سے بختاں کی آواز ہجوم کو چیرتی ہوئی نکلی۔

''بدبختا، ایہہ کی کر رھیا ایں!'' اس کی دہاڑ سن کر ماجھے نے اپنی کارروائی پوری کی اور ایک جھٹکے کے

ساتھ جھٹکے کھینچ ڈالے۔ تازہ تازہ سرخ خون کی ایک دھاری سی نکلی۔ چند کمزور دل لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں مگر سوائے بختاں کے اور کوئی آگے نہ بڑھا لیکن اس کے ماجھے تک پہنچنے سے پہلے وہ اس کے نزدیک سے گزرتا اڑن چھو ہو چکا تھا۔ بختاں جلدی سے زمین پہ دوزانو بیٹھی، ایک ہاتھ زخمی کان پہ رکھے روتی رانی کے پاس پہنچی۔ اس نے اپنی چادر اتار کے اس کے شانوں کے گرد پھیلائی اور اس کا سر اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''ماں صدقے جائے......'' ایک بار پھر اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''تیری کوئی عمر ہے، یہ کوئی عمر ہے...... میری رانیئے'' ایک بار پھر لفظ کپکپاتے ہوئے اس کے لبوں سے آزاد ہو رہے تھے۔

''بس کر بختاں اب دنیا کے سامنے ڈرامے کرنے کی کوئی لوڑ نہیں۔'' مائی رجی نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ماں ئی تجھے کیا پتا...... اس حالت میں عورت کو مرد پھول سے بھی مارے تو اسے پتھر کی طرح لگتا ہے...... تجھے کیا پتا یوں بھرے بازار میں سر کا سائیں...... عزت کا راکھا خود ہی عزت اتار دے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ تجھے کیا پتا مائی...... تجھے کیا پتا......'' وہ بلک بلک اٹھی۔

......❀......

بکھری چُپ

کبھی خود کو ٹوٹتے پھوٹتے بھی جو دیکھتے تو حزیں نہ تھے
مگر آج خود پہ نظر پڑی تو شکستِ جاں نے ہلا دیا

موہنی روڈ کے بس سٹاپ پہ ویسی ہی گہما گہمی تھی۔ دونوں طرف سے ٹریفک جاری تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کوئی کلرک دفتر بند ہونے پر گھر کی جانب موٹر سائیکل دوڑا رہا تھا، کوئی مزدور دیہاڑی سے فارغ ہو کے کسی تندور پہ بچھی چٹائی پہ بیٹھا بغیر گنے روٹیاں لوشوربے سے بھری پیالی میں ڈبو ڈبو کے کھا رہا تھا تو کسی نے دیہاڑی کے پیسے میلے صافے میں لپیٹ کے پیٹ پہ کس کے باندھ لئے تھے۔ کبھی وین والے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے پتھر باندھا کرتے تھے اور یہ پیسے باندھ رہا ہے۔ کیا اس سے یہ نامراد آگ اور نہ بھڑک اٹھے گی۔ یہ تو تیل کو تیلی دکھانے والی بات ہوئی ناں۔

اسے زور کی ہنسی آ گئی۔ اس نے ہنسنا چاہا مگر ہنس نہ سکی۔

"آج تو روٹی کے ساتھ لگانے کو چٹنی بھی نہیں اور تو سالن مانگ رہا ہے۔" اس کے کانوں میں اماں کی بپھری ہوئی آواز گونجی۔

"سارا دن ہڈیاں توڑتا ہوں، سردی گرمی کھپاتا ہوں، جسم کا سارا تیل نکل جاتا ہے اور تو خصم کے آگے یہ باسی ٹکڑے پانی میں بھگو کے رکھ رہی ہے۔"

"لا دے پیسے، ابھی دیگ چڑھا دیتی ہوں قورمے کی۔" اماں نے جھٹ ہاتھ بڑھایا۔

"گندی نسل کی زنانی، ہر وقت ہاتھ پھیلائے رکھتی ہے، کسی فقیر کی اولاد۔ مرن جوگی! میں مزدور ہوں، چور اُچکا نہیں جو روز شام مٹھی بھر نوٹ لا لا کے دکھاؤں۔" اسے ابا کی دہاڑ کی گونج نے دہلا کے رکھ دیا اور......اور اماں کی دوہائی نے۔

''ارے اُچکے ہی بھلے، اپنی اولاد کے پیٹ تو بھرے رکھتے ہیں ناں۔ اس ہڈیوں کے ڈھیر پہ چٹکی بھر بھی گوشت ہوتا تو اپنی بوٹی بوٹی تیرے آگے رکھ دیتی۔'' اور ابا کے منہ سے غلیظ گالیوں کا طوفان کف اڑانے لگا۔ آوازیں مدھم ہوتی چلی گئیں۔

''اور یہ کلرک ...... یہ سیلز مین ...... یہ بڑی بڑی کمپنیوں کے چھوٹے چھوٹے ملازم سڑکوں پہ کیوں بہے چلے جا رہے ہیں۔ کس بات کی جلدی ہے انہیں۔ کیا انہیں یاد نہیں کہ آج پچیس تاریخ ہے اور ایسی تاریخوں میں تو ان گھروں میں برتن بجا کرتے ہیں، سجا نہیں کرتے پھر یہ گھر کیوں جا رہے ہیں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''ایسے ہی ایک دن ایک برتن اماں کے ماتھے پہ لگا تھا اور اماں......'' اس کی آنکھوں کے سامنے خون سے لتھڑے دو مردانہ ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے جھرجھری لی اور آنکھیں بند کر لیں ''یہ اُجلے کپڑوں اور کملائے چہروں والے بچے، اتنے بھاری بستوں کا بوجھ کس سرشاری سے اٹھائے ہوئے ہیں۔ گھر جانے کی خوشی نے ان کے تھکے تھکے چہروں پہ کیسی تازگی دوڑا دی ہے۔ انہیں گھر جانے سے ڈر کیوں نہیں لگتا؟ کیا ان کا کوئی ابا نہیں ہے؟ ان کی کوئی دادی نہیں ہے؟'' وہ حیرانی سے سکول وین میں بھرے ہوئے اور تانگے میں لٹکے ہوئے بچوں کی کھلکھلاہٹ سن رہی تھی۔

''یہ ہنسی، یہ کھلکھلاتی ہوئی ہنسی، کتنی جانی پہچانی سی ہے۔ یہ بچپن کی بے پرواسی ہنسی، شاید...... نہیں میری تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔'' وہ آنکھیں میچ کے سوچنے لگی ''کیا کبھی میں بچپن میں ایسے ہنسی تھی شاید کبھی...... کبھی تو...... ایک آدھ بار۔ نہیں کبھی نہیں۔'' اس نے مایوسی سے سر جھٹکا ''ہاں ایسی...... بالکل ایسی ہی ہنسی شہناز کی ہوتی تھی۔'' شہناز، شنو، اس نے شنو کی سہیلی۔ دونوں میں کتنی باتیں ملتی جلتی تھیں۔ اس کا ابا بینک کا چوکیدار تھا اور شنو کا ایک صاحب کے ہاں۔ وہ بھی اکلوتی تھی اور یہ بھی۔ اس کی اماں کے سر میں بھی درد رہتا تھا اور اس کی اماں کے ماتھے پہ بھی ہر وقت دوپٹہ بندھا رہتا تھا۔ اسے یاد آیا۔

''جب آخری بار میں نے اماں کو دیکھا تب بھی اس کے سر پر دوپٹہ...... نہیں پٹی بندھی تھی، سفید پٹی۔ اماں کا سانولہ چہرہ اس روز مکمل سفید پڑ چکا تھا اور سفید ہی بے داغ لباس۔ ماتھے پہ سرخ سرخ دھبوں والی سفید پٹی۔ آہ اماں۔'' اس کے لبوں سے آہ آزاد ہوئی اور جلتی بلتی آنکھوں پہ ابا نے خون آلود ہاتھ جما دیئے۔

''اے شاہ عالمی اے جی، شاہ عالمی۔'' ہچکیاں لیتی رنگ اُڑی ویگن کے کنڈیکٹر کی جانی پہچانی آواز آئی۔

اس نے جلدی سے آنکھوں سے خون صاف کیا اور ویگن پہ چڑھ گئی۔

''آج تو جان ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں میڈم زاہدہ۔ چھٹی سے پورے بارہ منٹ اوپر لیے اس نے۔ پورے بارہ منٹ اور اگر کلاس میں کبھی دو منٹ بھی لیٹ پہنچو تو سب کے سامنے عزت اتار کے ہاتھ میں پکڑا دیتی ہیں۔'' کٹے بالوں والی لمبے قد کی گوری چٹی لڑکی نے اپنے ساتھ بیٹھی سہیلی سے کہا تھا جس نے اس قدر گرم

دوپہر میں بھی ہلکے رنگے بال کھول کے کمر پر پھیلا رکھے تھے۔ چند لٹیں پسینے سے گندمی رنگت والے چہرے پہ چپکی ہوئی تھیں۔

''لعنت بھجو یار۔'' اس نے فائل تھامتے ہوئے کہا۔ جس پر پڑوسی ملک کے دو نامور ہیرو اپنے اپنے مسلز کی نمائش کرتے ہوئے سجے تھے'' یہ بتاؤ شام کو گھر آ رہی ہو ناں، آج کیبل آپریٹر نے بڑی زبردست مووی لگانی ہے۔''

''دفع کرو، دل تنگ پڑ گیا ہے اب صائمہ کو دیکھ دیکھ کے۔ جب سے انڈین ڈرامے اور فلمیں بند ہوئی ہیں مزہ ہی نہیں رہا۔ وہی صائمہ کے بھاری بھرکم ٹھمکے اور وہی شان کے کھلے کھلے بے ڈھنگے کرتے اور......''

''ارے نہیں، آج انگلش فلم لگ رہی ہے۔'' اس نے جھک کے کٹے بالوں والی کے کان میں نہ جانے کون سی فلم کا نام لیا کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔ اس کے گولائی میں کٹے سیدھے بال چہرے کے دونوں طرف چھا گئے۔

وہ سیاہ ریشمی بالوں سے ڈھکا اس کا سرخ پڑتا کھلکھلاتا چہرہ تکنے لگی'' یہ کیسی لڑکی ہے؟ یہ بھی تو لڑکی ہے؟ میں بھی تو لڑکی ہی تھی۔ نہیں بھلا میں کب لڑکی تھی۔ میں تو کبھی بھی لڑکی نہیں رہی۔ میں تو عورت ہوں اور عورت تھی، پیدائشی عورت۔'' اس کی آنکھوں کے آگے کئی عورتیں چلنے پھرنے لگیں۔

پالنے میں لیٹی اماں کے پرانے دوپٹے کے لنگوٹ کسے ہوئے دو ماہ کی عورت۔

چولھے کے پاس ہانڈی پکاتی ماں کو ہمک ہمک کے دیکھتی، چمٹے ڈوئی اور بیلنے سے کھیلتی دو سال کی عورت۔

''باندھ کے رکھا کر اسے، گلی گلی پھرتی ہے۔ لڑکی ذات ہو کے لونڈوں کے ساتھ بھاگتی پھرتی ہے۔ جوان ہونے تک آنکھ میں حیا نہیں رہے گی۔'' ابا نے ایک ٹھڈا لگایا اور پسلیاں سہلاتی چھ سال کی عورت۔

''آئے ہائے کُڑیے، یہ کیا پہن کر پھر رہی ہے۔ فیجاں اپنی دھی کو کوئی ''مت'' دے یا خود ہی ہوش کر۔ موٹے کپڑے کا ڈھیلا کُرتہ سی کر دے۔ نامراد سانڈ کی طرح پھیل رہی ہے۔ دیکھ ذرا ویل کی قمیص سے جوبن کیسا پھٹا پڑ رہا ہے۔'' اپنی ہی ماں اور دادی سے کچا بدن چُراتی ہوئی بارہ سال کی عورت۔

''تیری ماں صفائی کر رہی تھی دوچھتی کی، سر پہ بکسا گرنے سے مرگئی، سمجھ گئی کُتی۔'' ابا کے ہاتھ سے چٹیا چھڑاتی ہوئی، ماں کی لاش کو ٹکر ٹکر گھورنے والی تیرہ سال کی عورت۔

زرد عورت......پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں والی عورت...... بے غیرت عورت......ڈھیٹ عورت......
ناچتی عورت......بین کرتی عورت......رُلتی عورت......بکتی عورت......

ایک کے بعد ایک عورتوں کے چہرے اس کٹے بالوں والی لڑکی کی اونچی گردن پہ آ آ کے اسے

چڑاتے رہے اور وہ چڑتی رہی۔

''اور یہ عورت...... یہ عورت...... دیکھو تو اسے، کیسے دیوانگی کے عالم میں تمہیں گھور رہی ہے۔'' سوکھی سڑی سی سہیلی کے ٹھوکا دینے پہ اس نے نظریں سامنے اٹھائیں اور اس کے ہنستے چہرے سے کسی نے ماسک اتار کر ایک خوفزدہ سی صورت سجا دی۔ وہ لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

''مائی گاڈ، یہ تو وہی پاگل ہے۔''

''رئیلی، از شی رئیلی میڈ؟'' دوسری نے اس طرف ٹکٹکی باندھ کے دیکھتی اجڑی آنکھوں والی، ڈھلکے جسم والی درمیانی عمر کی اس عورت کو غور سے دیکھا۔

''آئی ڈونٹ نو لیکن لگتی تو پاگل ہے۔ اکثر اسی ویگن میں ہوتی ہے۔ اسی طرح بلاوجہ کسی نہ کسی کو گھورے چلی جاتی ہے۔ تم ذرا اس کی آنکھیں دیکھو، کتنا عجیب سا فیل ہوتا ہے۔'' اس نے دوبارہ اسے دیکھنا چاہا اور وہیں ساکت ہو گئی۔ وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

''تمہاری کوئی دادی ہے؟'' اس نے آنکھیں گاڑے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!''

''تو پھر ہنستی کیوں ہو؟'' اس نے سخت انگلیاں لڑکی کی آدھی آستینوں میں پھنسے گداز بازو میں چبھوتے ہوئے کہا۔

''بچاؤ، اس پاگل سے بچاؤ۔'' اس کے ہاتھ سے فائل چھوٹ گئی۔ خوابوں کے شہزادے اپنے کسرتی چمکتے جسم لیے پیروں میں گرے ہوئے تھے۔ دونوں کھڑی ہو کر چلانے لگیں۔ ہر طرف سے اس پر پتھر برسنے لگے۔ بڑے بڑے نکیلے، تپتے، سلگتے ہوئے پتھر۔

''نہیں، نہیں، مجھے نہ مارو دادی...... نہ دادی، میں نہیں ہنسی۔ میں اب کبھی نہیں ہنسوں گی۔'' اس نے سوجے ہوئے ماتھے پہ ہاتھ رکھے رکھے منت کی اور چار فٹ کی مہندی رنگے بالوں والی تنکا سی دادی نے مسالا کوٹنے والا ڈنڈا پرے پھینکا اور ہانپتی کانپتی تپائی پہ ڈھے گئی۔

''نامراد، باچھیں چیرے رکھتی ہے۔ دیدوں کا پانی بالکل ہی مر گیا ہے۔ کس کی یاد آئی تھی جو بیٹھے بیٹھے قل قل کر پڑی تھی۔ مدرسے جا جا کے سہیلیوں میں ٹھٹھے لگا لگا کر بالکل ہی ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔ ختم کرتی ہوں تیرا یہ سہیلی پنا اور آنے دے اپنے پیو کو، تیری ٹانگیں کاٹ کر گھر بٹھواتی ہوں۔ نکل کے دکھا اب گھر سے پڑھنے کے بہانے۔'' دادی کی بلغم زدہ آواز پہ کنڈیکٹر کی پیک اڑاتی آواز شامل ہوئی۔

''اے جانکی دیوی اے جی، جانکی دیوی۔''

اس نے گود میں دھرا لفافہ بغل میں دابا اور ویگن سے اترنے والے مسافروں میں راستہ بنانے لگی۔

''تھینکس گاڈ، جارہی ہے۔توبہ! میری تو جان نکلنے والی تھی اس کی وحشی نظروں سے، ایسے لگ رہا تھا جیسے ابھی اٹھ کے دبوچ لے گی، پاگل۔''لڑکی نے اسے اترتے دیکھ کر ریلیکس ہوتے ہوئے سر سیٹ کی ادھڑی ہوئی پشت سے ٹکایا اور نظریں اس سرخ ٹائی والے نوجوان لڑکے پہ جمادیں جو اس کی خالی کی ہوئی سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔اس کا دل چاہا واپس پلٹے اور انگلیاں سچ مچ اس کے ننگے بازو میں گاڑ کے پوچھے۔

''ہنسی کیوں ہو؟'' لیکن وہ پتھر...... بڑے بڑے نکیلے اور تپتے ہوئے انگارہ پتھر۔ایک پتھر اچانک اس کے کان سے ٹکرایا۔

''نی اترتی کیوں نئیں؟'' پیچھے کھڑی لاچہ کرتہ پہنے، دودھ دہی کی کھٹی باس کے بھبکے اڑاتی کیم شیم سی عورت نے اس کی کمر پہ ٹھوکا دیا۔

جانکی دیوی ہسپتال کی پیلی، پلستر اکھڑی دیواروں والی عمارت ہمیشہ کی طرح اسے سکتے میں آئی ہوئی عورت جیسی لگی۔ایسا سکتہ جو کسی بھی وقت ٹوٹ جائے تو در و دیوار ڈھے جائیں۔اسی وجہ سے ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ جاتے ہوئے بدبودار اور سیلن زدہ راہداریوں پہ چلتی ہوئی وہ بوسیدہ چھتوں کی دراڑیں گنتی جاتی تھی، اب گری کہ اب۔

گیٹ پہ بیٹھے ہوئے پٹھان چوکیدار نے چٹکی بھر نسوار زبان کے نیچے رکھتے ہوئے اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔وہ پارکنگ کے قریب بے مقصد کھڑی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔چوکیدار کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کے مرے مرے قدموں سے چلنے لگی۔

''یہاں کھڑی ہو کے صاب لوگوں کو تکنے کے بجائے اندر جا کے دھندے سے کیوں نئیں لگتی۔''اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''اندر ہی جانا ہے مجھے اور کہاں جاؤں گی۔''اس نے ڈھیلے ست قدموں سے چلتے ہوئے جواب دیا۔یہ چوکیدار بھی بڑا شکی ہے ذرا دیر ہو جائے ایسے گھورتا ہے جیسے......

''تو پھر دیر سے آئی، بتا......'' اس کی کمر پہ لات پڑی تھی ''بتا، حرافہ کہاں گئی تھی۔دیکھتا ہوں آج کے بعد تجھے باہر کی ہوا بھی کیسے لگتی ہے۔آوارہ......'' ایک اور چوکیدار کے ٹھڈے، گھونسے، طمانچے اور گالیاں اس کا پیچھا کرنے لگیں تو اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا ''یہ چوکیدار سبھی شکی ہوتے ہیں، گند بھرے دماغ، غلیظ سوچیں......''

گرم اینٹوں کے فرش سے اتنی تپش اٹھ رہی تھی کہ اس کے کالے جوتوں کا گھسا ہوا تلوا اس کے آگے بے بس پڑ گیا تھا۔وہ کوئلوں پہ چل رہی تھی۔ان انگاروں پہ سفر جلد طے کرنے کے لئے اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔اندر حبس بھری تاریکی تھی۔باہر چلچلاتی دھوپ سے ایک دم اندر آنے پر اس کی آنکھیں اندر کے ماحول سے مانوس نہ ہو سکیں۔وہ ایک جانب دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔آہستہ آہستہ اندر کا منظر واضح

ہونے لگا۔ میلی دھوتی اور پسینے سے بھیگی بنیانوں والے بے شمار لاغر میلے فرش پہ ادھ موئے پڑے تھے۔ ان کے قریب ہی رنگ اڑے برقعوں کے سارے بٹن کھولے کئی زرد چہروں والی عورتیں تھیں۔ اس نے گھبرا کے نظریں چھت کی طرف اٹھائیں۔ دراڑیں، لاتعداد دراڑیں۔ جو یہ چھت ابھی گر جائے تو...... قصہ ہی ختم۔ اس نے باہر جھانکا۔ شعلے برساتے آسمان کے نیچے بے لباس زمین پہ اِکا دُکا لوگ بھاگنے کے عالم میں آ جا رہے تھے۔ بے چین بے چین سے لوگ۔ کیوں بے چین ہیں یہ لوگ۔ انہیں تو مطمئن ہونا چاہیے۔ ان کے سروں پہ کوئی بوسیدہ دیوار نہیں جس کے اچانک گر جانے کا خوف ہو۔

''کیسی بے غیرت پوتری ہے تیری بیباں، باپ مر گیا پر ایک آنسو تک نہ گرا۔'' کسی عورت نے ناک پہ انگلی دھر کے بین کرتی دادی سے کہا گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔

''نی کم بختے، پیو مر گیا ہے تیرا، کیسے پٹر پٹر تک رہی ہے ڈھلے دیدوں کے ساتھ۔ بے غیرت، یتیم ہو گئی ہے تو، سر پہ چھت نہیں رہی، روتی کیوں نہیں۔'' دادی نے اپنے سوکھے ہاتھوں کی بوچھاڑ اس کی کمر پہ کر دی۔

''ایسی چھت کا کیا فائدہ، جس کے سر پہ ہوتے ہوئے بھی مینہ بدن بھگوئے اور دھوپ ماس چیرے۔'' وہ چیخ اٹھی تھی ''اچھا ہوا وہ چھت نہ رہی جس کے سر پہ گرنے کا خوف ہر پل سانس سکھاتا رہے۔''

''پروین، تم آج بھی پونا گھنٹا لیٹ ہو۔ اندر ڈاکٹر رحیم وارڈ کے وزن کے لئے تیار کھڑے ہیں اور تم یہاں کھڑی دیدے گھما گھما کے جائزے لے رہی ہو، صفائی کرو جا کر۔'' ہیڈ نرس نے اسے جھڑکا اور ٹک ٹک کرتی ہیل کے ساتھ اوپر چڑھ گئی۔

ڈاکٹر رحیم سے بھی خاطر خواہ جھاڑ سکون سے کھانے کے بعد وہ اپنے کام میں جت گئی۔

جنرل وارڈ میں کچھ لوگ ایک بے سدھ وجود کاندھوں پہ ڈالے لائے اور ننگی زمین پہ ہی ڈھیر کر دیا۔ کیونکہ سارے بیڈ پہلے ہی سے ادھ موئے بیماروں سے بھرے پڑے تھے۔ کئی بستروں پہ دو دو مریض آڑے ترچھے پڑے تھے۔ اسے کسی اور کے ساتھ بھی لٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ نشے کا عادی تھا اور ایسے نشئی ذرا ہوش میں آنے کے بعد ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں، نشے کی طلب انہیں بے قابو کر دیتی ہے۔

''یہیں کسی کونے میں ڈال دو اسے۔'' ایک کھردری آواز پہ اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ گرم فرش پہ یوں پھیلا پڑا تھا گویا مخملیں بستر پہ دراز ہو۔ اس کا جھومتا سر بار بار دیوار سے ٹکرا جاتا۔ ایک بازو کمر کے نیچے مڑا پڑا تھا۔ پیلاہٹ مائل سبز ہونٹ اتنے پھٹ چکے تھے کہ ان سے خون رِس رہا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہو چکی تھیں۔ پلکیں گرد آلود اور آنکھوں کے آئینے گدلے ہو چکے تھے پھر بھی وہ اپنی تمام تر حالت سے بے نیاز نہ جانے کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا۔

''پتا نہیں کیا ملتا ہے ان بے وقوفوں کو زہر کے کش لگا کے، جانتے بھی ہیں موت کو گلے لگا رہے ہیں

پھر بھی مست رہتے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے ان سے گھڑی دو گھڑی کا نشہ انہیں کون سے غموں سے نجات دلا دیتا ہے۔'' یرقان میں مبتلا نوجوان نے اسے متوجہ کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''نشہ کوئی بھی ہو، آخر نشہ ہی ہوتا ہے، پُر کیف اور پُر سرور۔ چاہے دو گھڑی کا ہی ہو مگر دو جہانوں کے غم بھلا دیتا ہے۔'' وہ اس باؤ مریض سے کہنا چاہتی تھی مگر حسبِ عادت صرف سوچ کے رہ گئی۔ ایک نشے میں تو وہ بھی مبتلا رہ چکی تھی۔ بے خودی، خود فراموشی، خود اذیتی یا پھر شاید خود فریبی کا نشہ۔

ابا نہ رہا تو دادی کا وجود کیا بساط۔ یوں بھی اب اس کی سالخوردہ ہڈیوں میں وہ دم خم نہ رہا تھا کہ پہلے کی طرح اٹھ کے اس کی دھنائی کر سکتی۔ وہ کونے میں پڑی کھانستی رہتی، کوسنے دیتی رہتی اور وہ روز سویرے کنگھی پٹی کر کے کارخانے چلی جاتی۔ سہ پہر تک وہاں مشین کی گھر گھر میں الجھے رہنے کے بعد شام کو اپنا نشہ پورا کرنے چل پڑتی۔ یہ نشہ تھا ازل کی پیاسی روح کو ہوس کے غلیظ چھینٹوں سے سیراب کرنے کا۔ محبت کا یہ خوش رنگ زہر اس کی دن بھر کی تھکن اتار دیتا، بدن میں ایسی ہی سنسنی دوڑا دیتا جیسے اس نے ہیروئن کا سوٹا لگایا ہو یا بھنگ کا پیالہ پی لیا ہو۔ وہ رشتوں کی محبت کو ترسی ہوئی، رقعوں کی محبت سے خود کو بہلانے لگی۔ سراہے جانے کی طلب، چاہے جانے کی تڑپ اتنی بڑھی کہ وہ رقعوں سے پارکوں اور پھر کوارٹروں میں رُلنے لگی۔ وہ عشق کے سوٹے لگاتی رہی، ہوس کے دھوئیں کو چاندنی سمجھ کے نہاتی رہی، مست ہوتی رہی، مدہوش ہوتی رہی اور پھر...... پھر ایک دن اسے الٹی ہوگئی۔

''توبہ، مردود کو اٹھا کے باہر مارو، یہ ہسپتال ہے کہ کوئی نشئیوں کا اڈا۔ منہ بھر بھر کے الٹیاں کر رہا ہے۔ سارا فرش گندہ کر دیا، پہلے ہی صفائی کا کوئی حال نہیں اوپر سے چرسی لا کے بٹھا دیے ہیں غلاظت پھیلانے کو۔'' سارا وارڈ بکنے جھکنے لگا۔

وہ اسی طرح غلاظت میں لتھڑے کپڑوں پہ ہاتھ پھیرتا جھومتا رہا ''گند ہے تو کیا ہوا، اپنا تو ہے۔''

ایک اور عورت کی شبیہ لہرائی۔ غلاظت بھرے پیٹ پہ ممتا کا ہاتھ پھیرتی ہوئی۔ اس نے جھرجھری لے کر اس شبیہ کو پرے ہٹایا اور لمبے لمبے ہاتھ مارتی ہوئی فرش پہ فینائل کا پونچھا پھیرنے لگی۔

زچہ بچہ وارڈ میں آ کے اسے ہمیشہ کی طرح اوازاری کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ دوسری ماسیاں اس وارڈ میں زیادہ وقت لگایا کرتیں۔ حاملہ کو آزمودہ مشورے دینے میں، زچہ سے تکلیف دہ مراحل کے واقعات رغبت سے سننے میں ایک تو ''ٹیم پاس'' ہو جاتا دوسرا ان کے کپڑے بدلوانے، صفائی کروانے اور ہاتھ پیر دابنے کے پیسے الگ وصول ہوتے لیکن پروین کا دم گھٹتا تھا یہاں آ کے۔ جن کی ڈیلیوری میں چند ایک روز رہ گئے ہوتے ان کے منتظر تمتماتے چہروں سے آس اور امید کے سارے رنگ چوس لینے کو جی چاہتا۔ جن کی گودوں میں نومولود ہمک رہے ہوتے ان کے وجود سے پھوٹتی ماتا کی سرشاری محسوس کر کے وہ سلگ جاتی بس نہ چلتا ورنہ

جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بتاتی کہ یہ سرشاری، یہ فخر بس تھوڑے دن کے لئے ہے۔ اتنی آس، اتنی امیدیں، اتنی خواہشات، پیٹ میں ٹانگیں پسارے ایک لوتھڑے سے۔ اس نے بھی تو جہاں بھر لیا تھا، امید سے۔ آنکھیں بس خواب ہی بن کے تو رہ گئی تھیں۔ دنیا کیا کیا کہتی ہے اس کی ذات کو کتنی گالیوں میں پرویا جاتا ہے، اس کے کردار کے کتنے پرخچے اُڑتے ہیں، عزت کی دھجیاں کیسے تار تار کی جاتی ہیں، وہ سب سے بیگانی ہوگئی اس سے بھی کہ اس کے بنجر وجود کو یہ خوش آئند تحفہ دینے والا تک اس سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ اسے اس ہرجائی کے ٹھکرائے جانے کا غم بھی نہ ستاتا۔ وہ ہر لمحہ بس اس کی منتظر رہنے لگی جو اس دنیا میں اس کا خالص ترین رشتہ ہوگا، اس کی اپنی تخلیق۔ کوئی اس کے اس فیصلے کی راہ میں دیوار نہ بن سکے اس لیے اس نے ایک رات دادی کو یونہی کھانستے خون تھوکتے چپکے سے چھوڑ دیا اور لاہور چلی آئی۔ یہاں اس کی ماں کی دور پرے کی ایک خالہ تھی۔

ناقابلِ اعتبار رشتوں نے ایسے کوڑے مار مار کے داغ سلگائے تھے کہ اب وہ نئے رشتے کی تلاش میں تھی۔ یہ رشتہ وہ خود جنم دینا چاہتی تھی۔

دن جو مشکل تھے، طویل تھے، کٹتے چلے گئے۔ راتیں خوب بُن بُن کر آنے والے تھکے ہارے دن کو اوڑھاتیں۔ امیدیں سست پڑتے قدموں کو سہلاتیں۔ ڈھیروں خواہشوں کے ساتھ دل میں ایک خالص اور سچے رشتے کی پیاس لیے، کسی بہت اپنے کی چاہ لیے وہ دن بتاتی رہی۔ اسے کوئی تکلیف، تکلیف نہ لگتی۔ کوئی درد، درد محسوس نہ ہوتا۔ اسی پُر کیف و پُر سرور سی کیفیت میں اس نے اسے جنم دیا اور جیسے نشہ ٹوٹ گیا۔ وہ تو اپنے بازوؤں میں اس گل گوتھنے سے وجود کو بھینچنا چاہتی تھی۔ اس کا نرم نرم سرخ چہرہ دیکھنا چاہتی تھی، موٹی موٹی آنکھیں چومنا چاہتی تھی، ننھی اگلیوں سے کھیلنا چاہتی تھی۔ نازک لبوں کو چھیڑ کے، گدگدا کے کھنکتی قلقاریاں سننا چاہتی تھی لیکن نانی نے گڈے کے بجائے ایک عجیب سی چیز اس کی گود میں کراہیت سے پھینک دی۔ اِک قیامت تھی جو پروین کی جھولی میں گری تھی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے کالے گوشت کے اس بدہیت لوتھڑے کو تکنے لگی جس میں کوئی نشانی راج دلاروں والی نہ تھی۔

"یہ لے مائی، میرے شہزادے کے سر کا صدقہ۔" ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ سر اٹھا کے اس چھائیوں والے چہرے کی طرف دیکھا۔ چار بیٹیوں کی ماں اس بار ایک بیٹے کو جنم دے کے گویا دنیا فتح کر بیٹھی تھی۔ ڈسچارج ہو کر گھر جانے سے پہلے وہ تمام نچلے عملے کو بیس بیس روپے بانٹ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے پیسے تھامے اور دعا دی۔

"بی بی، اللہ تجھے تیری اولاد سے بچائے۔" وہ عورت بدک کے پیچھے ہٹی۔ دوسری ماسی نے اسے تسلی دی۔

"نہ بی بی، غصہ نہ کرو۔ یہ تو بے چاری "شوائن" (پگلی) ہے۔"

کھردری ہتھیلی میں پسیجے دس دس کے نوٹوں نے اسے یاد دلا کہ آج اسے ہر صورت گھر جاتے ہوئے

سو ڈیڑھ سو روپیہ لے جانا ہے۔ تنخواہ ملنے میں تو ابھی ہفتہ باقی تھا ''شاہد تو جان کھا جائے گا میری۔'' ڈیڑھ کمرے کے کوارٹر میں اب رہ بھی کیا گیا ہے جسے ٹھکانے لگا کے اس کا غصہ اترے۔ لے دے کے میری کم بختی ہی آنی ہے۔'' اس نے فکر مندی سے سوچا اور نرسوں کے کمرے کی طرف مڑ گئی اور وہ مائی پروین جسے شاید ہی سارا سارا دن کوئی لب ہلاتے دیکھتا ہو، اب اِک تواتر کے ساتھ منتیں کرتی ہوئی کبھی سسٹر شمیم تو کبھی سسٹر ریٹا سے ادھار مانگ رہی تھی۔

''تمہارا تو ہر وقت کا یہی رونا ہے۔ دس بیس روپے تو چلو اللہ واسطے کبھی کبھار دے دیے، اب اکٹھے سو دو سو روپے مانگنے لگ گئی ہو۔ ہم بھی تنخواہ دار لوگ ہیں۔'' سسٹر شمیم نے اکتا کر کہا۔

''تساں سارے تھوڑے تھوڑے کر کے دے دو۔ آپے دو سو ہو جائیں گے۔'' اس نے حل پیش کیا جو انہیں مزید بھڑکا گیا۔

''لو اچھی دھونس ہے۔''

''اور کیا، کوئی زبردستی ہے۔ کیسے چندہ اکٹھا کرنے بیٹھ گئی ہے۔''

''جاؤ مائی، ذرا جا کے ان لاکھوں کمانے والے ڈاکٹروں سے مانگو جنھوں نے مریضوں کا خون چوس چوس کر جائیدادیں کھڑی کی ہوتی ہیں اور ہم رت جگے کاٹ کاٹ کر بمشکل اپنے بچے پال پاتے ہیں۔ اللہ واسطے دینے کے لیے بچتا ہی کیا ہے۔'' پروین اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہماری کوئی حرام کی کمائی نہیں جو اڑائیں۔ حق حلال کے پیسے ہیں۔ کلیجہ کٹتا ہے جو ایک پیسہ اِدھر اُدھر ہو جائے۔'' کوریڈور تک آتے آتے ان کے بلند تبصرے اس کے قدم اور ڈھیلے کر گئے۔

''سچ ہی تو ہے۔ حرام کی کمائی کھو جائے، لٹ جائے دکھ نہیں ہوتا۔ حلال کی سینت سینت کے رکھنے کو جی چاہتا ہے۔'' اس کے اندر سے کسی نے تائید کی۔

''آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھتی ہے اب پینو، یہ تو نے ہی جنا ہے۔ کتنا کہتی تھی میں چھٹکارا پا لے اس گناہ کی پوٹ سے۔ تجھے ہی شوق چڑھا تھا جننے کا اب بھگت۔ حرام کے کاموں کا یہی نتیجہ ہوتا تھا۔ اب اچھا سبق ملا تجھے۔ تو کسی کو نہ بتا، یہ خود ہی اپنی اصلیت کا اعلان کر رہا ہے۔ عذابِ الٰہی ہے، قربِ قیامت ہے۔ یہی سب کہہ رہے ہیں لوگ اس دیکھنے کے بعد'' اس کے سکتے کو نانی کی لعنت ملامت نے توڑا۔ پروین نے پھر سے بڑے دھیان کے ساتھ اسے ٹٹولا۔ سر جسم کے مقابلے دگنا تھا اور بے ڈول بھی۔ کھنچی ہوئی آنکھیں اچھے خاصے فاصلے پہ تھیں۔ ناک بیٹھی ہوئی اور بھوؤں پلکوں کے بال غائب تھے۔ اوپر والا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ سننے اور بولنے کی صلاحیت سے قدرتی محروم وہ اس کی گود میں یوں پڑا تھا جیسے کسی بچے نے غصے میں آ کر اپنے گڈے کا حشر نشر کر کے ایک کونے میں پھینک دیا ہو۔ وہ چیخ چیخ کے روئی تھی۔ بال نوچ نوچ کے بلکی تھی اور

سینے پہ دوہتڑ مار مار کے بین ڈالے تھے۔

''بس کر کڑیئے۔'' بس کر۔ جتنا رونا تھا رو لیا، سمجھ لے مرا بچہ جنا تھا اسی کو رو رہی ہے۔ ویسے بھی یہ بچتا لگتا نہیں اور جو بچ بھی گیا تو بھلا جی کے کیا کرے گا، یہ تو خود کو گھسیٹنے جوگا بھی نہیں، تجھے نیا روگ لگا دے گا۔ میں تو کہتی ہوں اسے ادھر ہی ہسپتال کے پیچھے کسی کونے میں پھینک دے۔'' اس کے چاؤ سے سیئے گئے پوتڑے اور ننھے ننھے کُرتے ٹوکری میں بھرتے ہوئے چلنے کی تیاری کرتی نانی نے صلاح دی۔ ابھی ابھی نرسوں کی ڈانٹ ڈپٹ کے نتیجے میں وہ بھیڑ چھٹی تھی جو کانوں کو ہاتھ لگا لگا کے اس عجیب سے بچے کو دیکھنے کے لیے جمع تھی۔

''لیکن نانی...... یہ...... یہ میری اپنی اولاد ہے، کیسے پھینک دوں اسے کہیں۔ نو مہینے جس کو دیکھنے کی چاہ میں تل تل مرتے ہوئے گزارے اسے نو گھنٹے بعد ہی خود سے الگ کر کے کیسے رکھ دوں۔ کیا کیا خواب نہ دیکھ ڈالے تھے میں نے اس کے حوالے سے۔ کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا اس کے لیے۔'' وہ شش و پنج میں تھی۔ تمناؤں کا محل زمیں بوس کرنے والے وجود سے گھن بھی آ رہی تھی اور دل کا اِک گوشہ اس کی طرف پوری رفتار سے کھنچ بھی رہا تھا۔

اسے ساتھ لے جا کر کیا تیرے خواب پورے ہو جائیں گے۔ نری دردسری ہے بدبختے، عقل کر۔ میں پہلے ہی کہتی تھی اونچے اونچے خواب نہ دیکھ۔ میرا لعل یہ کرے گا، میرا راج دلارا یہ بنے گا، یہ ہو گا وہ ہو گا۔ میرا شہزادہ پتر میری ساری کمیاں پوری کرے گا۔ اونہہ، بھلا کیکر کے روکھ (پیڑ) پہ کبھی گلاب اُگتے ہیں۔ خدائی سے ٹکر لینے چلی تھی نمانی، کتنا سمجھایا کہ ہر چیز کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ قدرت نے قانون بنایا ہے، ہر چیز اپنے نظام سے چلتی بھلی لگتی ہے۔ اولاد کی اتنی چاہ ہے تو کسی بھلے مانس سے دو بول پڑھوا، حق حلال سے کسی جی کی ہو، خدا بھی نوازے گا۔ حرام رستے پہ چل کر ماں کے رتبے تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ گناہ کی کیچڑ سے لتھڑے پیروں تلے جنت کیسے آ سکتی ہے۔ دیکھ لیا اپنے کرتوتوں کا انجام۔ اب بھی عقل کر اور چھٹکارا پا لے اس گناہ کے منہ بولتے اشتہار سے۔ اس نے تجھے سوائے عمر بھر کے رونے اور کلسنے (تڑپنے) کے اور کچھ نہیں دینا۔ میری دھی اِکو دفعہ رو لے بڑا دل کر کے۔'' وہ بولتی جاتی تھی اور اس کے بے جان پڑتے وجود کو گھسیٹتی جاتی تھی۔

''نانی یہ...... یہ تو رو بھی نہیں سکتا۔'' وہ اسے ہسپتال کے پیچھے والے بڑے سے خالی پلاٹ میں جو گندگی اور کوڑے سے اٹا پڑا تھا، لے جاتے ہوئے سسک پڑی۔ ''کسی کو کیسے پتا چلے گا، یہ یہاں ہے۔''

''نہ چلے، دیکھ کر کونسا کسی نے کلیجے میں بھر لینا ہے۔'' نانی کے دل میں رتی بھر گنجائش نہ تھی، اس نے ایک نہ سنی اور اپنی کر کے چھوڑی۔ پروین کئی راتیں سو نہ سکی۔ اسے ایسے چپ لگی جو آج پچیس سال بعد بھی ٹوٹنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ وقت نے کیسے کیسے رنگ بدل کے اسے بولنے پہ اکسانے کی کوشش کی۔ جب کرم دین کا رشتہ آیا وہ تب بھی چپ رہی۔

''رنڈوا ہے تو کیا ہوا، زمانہ تجھے بھی تو بیوہ ہی سمجھتا ہے۔عمر والا ہے تو کیا ہوا، کماتا تو اچھا خاصا ہے۔ تیرے پاس کیا ہے خالی ہاتھ، ننگا سر۔ میں آج ہوں کل نہیں، زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہاں کر دے۔'' اس کی چپ کے آگے ہار کے نانی نے لہجہ بدلا ''میں جانتی ہوں تو اب تک اس نمانے کو بھول نہیں سکی۔ سچے دل سے اپنے گناہوں کی توبہ کر اللہ پاک سے اور صاف دل سے ایک مرد کی ہو جا۔ اللہ تجھے برکت والی اولاد سے نوازے گا۔ ویسی جیسی تو چاہتی تھی، سکھ دینے والی، آنکھوں کی ٹھنڈ، کلیجہ ٹھار کر دینے والی۔ مرد کی طلب نہیں پر اولاد کی چاہ تو ہے ناں تجھے اسی کے لیے راضی ہو جا۔'' اور وہ یہ جوا کھیلنے کو تیار ہو گئی۔ ساٹھ سالہ کو چوان کرم دین پکا جواری تھا۔ وہ جیسے تاش کے پتے پھینٹتا تھا اسی طرح ذرا ذرا سی غلطی پہ پروین کو پھینٹ کے رکھ دیتا۔ مشکی گھوڑے پہ جس طرح لش لش کوڑے برساتا، اس کی ننگی پیٹھ پہ بھی اسی طرح تابڑ توڑ حملے کرتا۔ وہ بد دعا دیتے دیتے رک جاتی جس لوبھ میں اس ہڈیوں کی مٹھ سے ناتا جوڑا تھا وہ لعل حاصل کیے بغیر اسے قبر میں جانے کیسے دیتی۔ دوسرے ہی سال جب قدرت نے اس کی جھولی بھر دی تو وہ پاگل دیوانوں کی طرح اسے چومے جاتی۔ اللہ کے حضور شکرانہ ادا کرتے ہوئے لفظ ٹوٹ ٹوٹ جاتے۔ چپ نے ایسا حصار باندھا تھا کہ آوازیں بڑی اوکھی ہو کر اندر سے راستہ بناتی نکلتیں۔

وہ جو سوچتی تھی کہ ایک بار بیٹے کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہو جائے وہ دنیا کو جوتی کی نوک پہ رکھے گی۔ کرمو کا چابک والا ہاتھ روک کر ایسی ایسی دل جلی بد دعا دے گی کہ خدا بھی اسے ایڑیاں رگڑتی موت دینے پہ مجبور ہو جائے گا لیکن...... لیکن ہوا کیا۔ اس کی کمر پہ شڑ شڑ چابک پڑتے رہتے، سر پہ کھرے چمڑے کا کھسا تبڑ تبڑ بجتا رہتا اور وہ جھلی نمانی شیدائیوں کی طرح اپنے سوہنے پتر کو تکتی جاتی۔ اس کی قلقاریاں سن کر کمر سہلانا بھول جاتی، کوسنے بد دعائیں دینا کب یاد رہتا۔ وہ اب یہی چاہتی تھی کہ بھلے سارا پنڈا (جسم) نیلوں نیل ہو جائے لیکن کرمو جیئے۔ اتنا جیئے کہ ایک دن شاہد لیک کے اس کا ہاتھ تھامنے کے قابل ہو جائے۔ بھلا اس سے اچھی موت کیا ہو گی اس کے لئے لیکن کرم دین نے جلدی جلدی دو تین سال نمٹائے اور چٹ پٹ ہو گیا۔ اب اس کی تمام تر امیدوں کا مرکز شاہد تھا۔ اولاد تو سبھی پالتے ہیں لیکن اس نے اسے سینچا تھا۔ اس کی جڑوں میں پانی کی بجائے خون ڈالا تھا۔ دھوپ، تیز ہوا، کڑکتی بجلی، برستی برساتیں، ہر کڑے موسم اس نے خود جھیلے، اپنے جگر گوشے پہ اک ہلکی سی آنچ تک نہ پڑنے دی۔ اسے اس دن کا انتظار تھا جب یہ پودا تناور درخت بن جائے گا اور وہ اپنے آخری دن اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں گزارے گی۔ ابا کے ٹھڈے، دادی کے طمانچوں، کرموں کے چابکوں کے داغ آپوں آپ ہلکے پڑ جائیں گے۔ وہ لڑکی تھی کمزور ذات۔ ماں پہ پتیل کی دیگچی کا وار نہ روک سکی نہ ہی اس کی لاش پہ بندھی سفید پٹی کا راز کسی کے آگے کھول سکی لیکن اس کا جوان پتر اس کی ڈھال بنے گا، سر کی چھت، پیر کی زمین بنے گا...... لیکن...... نہ جانے کیا بات تھی۔ کتنی ہی برساتیں گزر

گئیں، کئی جاڑے بیت گئے۔ پنڈے نے کتنی گرمی سہہ لی......لیکن یہ درخت چھاؤں دینے پہ آمادہ ہی نہ تھا۔ اس کی شاخوں پہ پھلتی پھولتی ننھی کونپلیں پھوٹتی دیکھ کے اسے لگا اب ستانے کے دن آئے ہیں لیکن ابھی ہریالی صحیح طرح ہری بھی نہ ہوئی تھی کہ اسے خزاں چاٹ گئی۔ بھولی نہیں جانتی تھی کہ اس پودے کو اوڑھنی کی اوٹ دے کر سارے موسموں سے بچا سکتی ہے، اولوں کے وار سے، بارش کی پھوار سے، جاڑے کی ٹھار سے......لیکن خزاں کی مار سے نہیں بچا سکتی۔ خزاں کا رستہ کون روک سکا ہے، یہ ڈائن تو جڑیں پیلی کر کے چھوڑتی ہے۔ یہ پودا اونچا ہو چکا تھا، تنا بھی پھیل گیا تھا لیکن پتوں کی چادر نہ تن پائی تھی۔ اس کی ننگی شاخیں ڈھانپنے کے لیے اب بھی پروین کو ہاتھ اونچے کر کر کے سایہ دینا پڑتا تھا۔ اس کی چپ نے پھر دم سادھ لیا۔

ہتھیلی میں پسیجے نوٹ اس نے بٹوے میں ٹھونس کر گریبان میں اڑس لیے۔ ہانپتے کانپتے ڈگمگاتے قدموں سے اپنی زندہ لاش گھسیٹتی وہ کوارٹر تک پہنچی تو اس کا کواڑ چوپٹ کھلا دیکھ کر دوہتڑ سینے پہ مار کے رہ گئی۔

''ہائے میں مرجاواں۔'' اکلوتے کمرے میں پڑی واحد چارپائی غائب دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ شاہد کی نشے کی لت پوری کرنے کے بعد اس کی قلیل سی تنخواہ میں بچتا ہی کیا تھا کہ وہ گھر کی ضرورت کی معمولی چیزیں بھی لے پاتی، جو تھوڑی بہت تھیں، وہ بھی رفتہ رفتہ اس کے ہتھے لگتی جارہی تھی۔ وہ بے بسی سے ننگے فرش پہ گر گئی۔

''آ گئی تو، کہاں مری پڑی تھی، پتا نہیں میرا کیا حال ہو رہا ہے۔'' بے ڈھنگے پن سے ڈولتا، گھنے بکھرے بالوں میں خاک اڑائے، اونچے قد کے ساتھ ہڈیوں بھرا وجود لیے، منہ سے جھاگ اُڑاتا یہ اس کا شہزادہ پُتر تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چپ چاپ اسے تکنے گئی۔ اسے لگا آج بھی کرمو کا چمڑے کا بدبودار کھسا اس کے تالو پہ بج رہا ہے۔

''بولتی کیوں نہیں؟'' نشے کی طلب نے اسے جنونی کر ڈالا تھا۔ آنکھیں لال ہو رہی تھیں، پتلیاں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ وحشت ناک انداز میں دونوں ہاتھوں سے اپنی ہی بوٹیاں نوچتا ہوا وہ اسے مخاطب کر رہا تھا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں، کہاں غائب تھی صبح سے؟'' جواب میں وہ یہ بتانا چاہتی تھی کہ سارا سارا دن کیسے ہڈیاں توڑ کے، پاپڑ بیل کے وہ اس کے لیے چار پیسے اکٹھے کر کے لاتی ہے مگر کہہ نہ سکی۔ اس نے کونسا ماں کے ہاتھ چوم لینے تھے۔

''میں کہتا ہوں نکال پیسے......'' اس نے ماتمی بت بنی ماں کو ایک ٹھوکر کیا ماری گویا اس کے برسوں پرانے زخم ادھیڑ دیے۔

''نہیں!'' وہ چیخی اتنے زور سے جیسے شاہد نے اسے بے جان سی ٹھوکر نہ ماری ہو بلکہ ہزاروں فٹ اونچے پہاڑ سے دھکا دے ڈالا ہو۔ شاہد ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹا ''نہیں دوں گی، کبھی نہیں دوں گی......'' یہ ٹھوکر

اس کی زندگی کی سب سے بے رحم سب سے سفاک سب سے شدید ٹھوکر تھی جس نے اس کے اندر باہر دراڑیں ہی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ وہ زار زار روتے ہوئے پھر سے اپنی بوٹیاں نوچنے لگا۔

''کیوں نہیں دے گی، ہیں تو پھر نکال، مجھے نہیں دے گی تو اور کس یار کے لیے چھپا کے رکھے ہیں۔''

وہ جو اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کے پھر سے موم ہونے لگی یہ رکیک جملہ سن کر نئے سرے سے بھڑک اٹھی۔

''ہائے کرمو، تو مر گیا لیکن اپنا چابک چھوڑ گیا سدا میری کمر پہ برسنے کے لیے۔'' اس نے دوہائی دی

''تو ہوش میں نہیں بے غیرت، دیکھ نشے نے تیرا کیا حال کر دیا ہے۔ ماں کو گالی دے رہا ہے!''

''تو ماں نہیں ہے، اگر ہے تو دے پیسے۔'' اس نے گریبان سے جھانکتے کالے بٹوے پہ ہاتھ ڈالنا چاہا تو پروین نے اس کے زرد چہرے پہ زندگی کا پہلا تھپڑ مارا۔

''شرم کر بے حیا، کہیں ڈوب مر!''

''میں کیوں مردوں، تو مر۔'' اس نے پروین کو دھکا دیا۔ وہ سنبھل نہ سکی اور پیچھے پڑے لوہے کے زنگ خوردہ بکسے سے جا ٹکرائی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ بٹوا نکال کر بھاگ گیا۔ وہ ذرا سا سہارا لے کر بیٹھی۔ انگلیوں سے ماتھے پہ بہتے خون کو محسوس کیا جو بہہ کر آنکھ سے نکلتے دریا میں شامل ہو رہا تھا۔ بازو پہ لگی شاہد کے ناخنوں کی خراشیں دیکھ کر وہ ہذیانی انداز میں چیخ اٹھی۔

''کیوں؟ کیوں وہ لے گیا میرے پیسے...... یہ تو میری حق حلال کی کمائی تھی پھر کیسے کوئی لوٹ سکتا ہے۔ جھوٹ ہے، سب جھوٹ ہے کہ حرام مال سدا پاس نہیں رہتا اور حلال روزی کوئی چھین نہیں سکتا۔ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔'' چیختے چیختے وہ نڈھال ہو گئی۔

''نانی، تم تو کہتی تھی مری اولاد کو ایک بار رو لے چین آ جائے گا۔ میں نے سمندر بہائے چین نہ آیا، بین ڈالے صبر نہ آیا۔ آتا بھی کیسے، وہ میرے سامنے تو نہیں مرا تھا۔ اگر وہ پورا زندہ نہ تھا تو مرا ہوا بھی تو نہ تھا۔ میں نے خود اسے موت کی گود میں ڈالا، یہ احساس میرا دل بند کر دیتا تھا پھر تیری بات یاد آتی تو پچھتاوے کم ہونے لگتے کہ حرام کی کوئی چیز سکھ نہیں دیتی اسے خود سے دور کرنا ہی اچھا۔ وہ میرے بُرے کرموں کا پھل تھا اس لیے زہر آلود تھا لیکن نانی خدا گواہ ہے کرم دین سے نکاح کے بعد میں نے کسی کو آنکھ اٹھا کے نہ دیکھا تھا۔ یہ میری حق حلال کی اولاد ہے۔ یہ میرے گناہ کا تحفہ نہیں۔ میرے حوصلے، میرے صبر اور میری برداشت کی نشانی ہے پھر کیوں...... کیوں؟''

سالوں کا سکوت کُرلانے لگا۔ پہلی بار خود سے وہ ایک سوال کر رہی تھی لیکن فضا میں بکھری چُپ کی دہشت کوئی جواب دینے سے قاصر تھی۔

......❀......

وہ تو بس میں

آج وہ پھر آ گیا ہے۔
مانا کہ مجھے اس کا انتظار تھا......
مانا کہ مجھے ہمیشہ اس کا انتظار رہا ہے...... پہلے بھی اور اب بھی۔
لیکن اب دل کو اس کے آنے کی پہلے سی خوشی نہیں ہوتی۔
راہ پہ لگی تھکی ہاری آنکھیں اب اسے سامنے پا کے نہیں جگمگائیں۔
لب پہ رکی رم جھم باتیں چھم چھما چھم نہیں برستیں۔

اب تو وہ آئے بھی تو دل پہ رکھا بوجھ یوں دگنا ہو جاتا ہے جیسے روئی کے ڈھیر پہ کوئی ڈھیروں پانی گرا کے اسے وزنی کر دے۔ وہ نظر بھی آئے تو پلکوں پہ خراشیں سی ابھرنے لگتی ہیں۔ گھٹی گھٹی سی آہیں، سسکیاں تک دم سادھ لیتی ہیں تو باتوں کو آواز کا رستہ بھلا کیسے ملے۔ لیکن وہ ہے کہ آنا نہیں چھوڑتا۔ پھر چلا آیا ہے۔...... میری تمام تر بے اعتنائی اور بے گانگی کے باوجود۔

میں نے ایک پر تھکن آہ بھر کے سامنے دیکھا...... وہ ڈھیلے قدموں سے چلتا آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کل کی طرح پھول ہیں...... میرے لیے...... ایک تلخ سی مسکراہٹ نے میرے لبوں کو زہر آلود کر دیا۔

''اب یہ پھول کس لیے سرکار...... کیا سنگ ختم ہو گئے یا اٹھانے کی سکت نہیں رہی؟''

مگر میں کہہ نہ سکی میں نے اس سے بات نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے شاید میری مسلسل بے رخی اس کے قدم روک دے اور وہ آنا چھوڑ دے لیکن میری کوئی خطا معاف نہ کرنے والا...... میری ذرا سی لغزش پہ کسی بھی ناپسندیدہ حرکت پہ دنوں ناراض رہنے والا، میری توجہ میں ذرا سی کمی پا کے منہ پھلا لینے والا اب کتنا وسیع القلب بنا ہوا ہے یا شاید مستقل مزاج...... تحمل مزاج...... یا پھر ڈھیٹ...... جواب میری اتنے دنوں کی چپ بھی اسے مشتعل نہیں کر رہی۔ وہ تقریباً روز آتا ہے میں منہ پھیرے اس کی ہر بات سنتی ہوں، بس جواب نہیں دیتی۔

اس کی کسی صفائی پہ کان نہیں دھرتی۔ اس کے باوجود اس کی انا پہ ضرب نہیں پڑتی۔ حیرت ہے۔

خیر، دیکھیں گے سرکار! کب تک آپ کا صبر سلامت رہتا ہے کب تک آپ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہیں مسلسل کھٹکھٹانے پہ بھی جب در بند ملے تو بھکاری تک واپس لوٹ جایا کرتے ہیں آپ تو پھر آپ ہیں سخی داتا جو مجھے بھکارن کی طرح جھکتے دیکھ کر کچھ نہ کچھ مانگتے ہوئے دیکھتے رہنے کے عادی ہیں۔ اب نہ میں جھک رہی ہوں نہ مانگ رہی ہوں پھر میرے پاس کیا لینے آتے ہو؟

''چلے جاؤ، خدا کا واسطہ ہے چلے جاؤ۔''

اس نے میری طرف پھول بڑھائے تو میرا دل چلا اٹھا۔ لیکن میں چپ چاپ منہ پھیرے رہی۔ اس نے چپکے سے پھول میرے نزدیک رکھ دیئے ان کی بھینی بھینی مہک بھی میرا دل نہ پگھلا سکی۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' شادی کو فقط دو ماہ ہی تو ہوئے تھے جب وہ مجھ پہ چلایا تھا اور میں نے بھلا کیا کہہ دیا تھا۔ صرف اس کی بے اعتنائی کا گلہ ہی تو کیا تھا۔ نئی نویلی دلہنوں والا کونسا چاؤ تھا جو اس نے میرا اٹھایا تھا۔ اتنی بلند آواز پہ میں سہم کے رہ گئی تھی اور ڈر کے ادھ کھلے دروازے کی جانب دیکھنے لگی جس کے ذریعے اس کی دھاڑ بخوبی باہر بیٹھے افراد تک گئی ہوگی۔ اتنے لوگوں کے سامنے خجالت کے احساس نے میری بولتی بند کر دی۔ حالانکہ پہلے ہی میری آواز کم کم نکلتی تھی۔ ملتجی نظروں سے اب چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے میں نے منت بھی کی تھی لیکن وہ کہتا رہا۔

''بیوی ہو تو بیوی بن کے رہو۔ معشوقہ بننے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میں سڑک چھاپ عاشقوں کی طرح تمہارے نازنخرے اٹھا سکتا ہوں۔ ایسے ہی شوق تھے تو شادی سے پہلے پورے کر کے آنے تھے۔ اب میں کام دھندا چھوڑ کے تمہارے آگے پیچھے پھرتا رہوں۔ تمہارے حسن کے قصیدے پڑھتا رہوں یا پھول لالا کے بھینٹ چڑھاتا رہوں۔ پتا نہیں کیسا ذہن ہے تمہارا۔ اور کیا واہیات سوچیں کلبلاتی رہتی ہیں۔''

بیوی کو پھول دینے کی حرکت کو سراسر واہیات سوچ قرار دینے والا اب کام دھندا چھوڑ کر میرے آس پاس کیوں منڈلا رہا ہے جبکہ میں ہمیشہ کے لیے اس کا گھر چھوڑ آئی ہوں۔

''جب سے تم گئی ہو، گھر گھر نہیں لگتا نائلہ!'' کتنی دیر سر جھکائے بیٹھے رہنے کے بعد وہ بولا۔ وہی بات جو وہ ہمیشہ آ کر کہتا ہے۔ میں نے دل اور سخت کر لیا۔

''نہیں لگتا تو نہ لگے۔ وہ گھر تھا ہی کب مجتبیٰ! آج تمہیں لگ رہا ہے کہ جس مکان میں تم رہتے ہو وہ گھر نہیں۔ حالانکہ مجھے ان در و دیوار کو چھوڑے دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں اور میں۔ میں جو بارہ سال تک وہاں رہی مجھے تو ایک دن بھی وہ گھر، گھر نہ لگا۔ اس کے باوجود میں رہی۔ کیا میں تم سے یہ کہنے کی ہمت کر پاتی؟ بارہ سال تک نہیں۔ اور جب کہا تو تمہارا جواب کیا تھا، یہی نا کہ جس عورت کو شادی کے بارہ سال بعد بھی شوہر کا گھر اپنا

گھر نہ لگے، اسے اس جگہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔تم جا سکتی ہو نائلہ! اور میں چلی آئی۔ اب کیا کرنے آتے ہو میرے پیچھے۔''

''تم نے جانے سے پہلے ایک بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا نائلہ۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''تمہارے بارے میں...... ہاں سوچا تھا اور یہی سب سوچ کر تو وہاں سے نکلی تھی سب کچھ سوچا تھا۔ سب کچھ یاد کیا تھا، تمہاری بے زاری، تمہاری بے اعتنائی، تمہاری لاپروائیاں، تمہاری تندو تلخ باتیں، کلیجہ چیرتے طعنے، کانوں میں سیسہ پگھلاتی گالیاں جو تم بلا تکلف کسی کے سامنے بھی سنا دیا کرتے۔ تمہارا بلا جھجک ہاتھ اٹھا لینا۔ میری ہر خواہش، ہر ضرورت، ہر شکایت سے بے نیاز بنے رہنا۔ یہ سب ہی یاد آیا تھا مجھے سوچنے پہ اور مجھے اپنا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی اور شاید تم نہیں جانتے تھے کہ میں کس قدر ضدی ہوں۔ ضد میں آئی تو تمہارے ساتھ نبھا کرنے میں بارہ سال صبر سے گزار دیے۔ اکیلے میں کبھی اختیار نہ رہا ہو تو دوسری بات ورنہ کسی کے سامنے آہ تک نہ بھری۔ اور اب جب صبر کی حد تمام ہوئی تو مجتبیٰ احمد! جبر کرنے میں بھی صدیاں بتا دوں گی۔ ہاں جبر، خود پہ جبر۔ اب تک تم مجھ پہ جبر کرتے آئے ہو۔ اب میں کروں گی، کسی اور پہ نہ سہی خود اپنے آپ پہ۔''

''بچے تمہارے بغیر ہ پا رہے۔'' اب اس نے اور طریقے سے مجھے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

''بچے میرے ساتھ رہتے ہی کب تھے؟'' میں نے یہ کوشش بھی ناکام بنا دی۔

اور یہ سچ تھا، میرے بچے اگر میری گود کے عادی ہوتے، میرے ہاتھ سے لقمہ لینے والے میری لوری سن کے سونے والے۔ تو میں کبھی ان کو چھوڑنے کا تصور تک نہ کر پاتی لیکن وہ بچے جن کی آمد کا انتظار تم نے اور تمہاری ماں بہنوں نے بڑی بے صبری کے ساتھ تین سال تک کیا تھا وہ تو مکمل طور پہ ان کی جاگیر تھے۔ میں نے تو صرف نو ماہ تک انہیں کوکھ میں رکھنے اور پھر جنم دینے کا فریضہ انجام دیا تھا اور پھر ایک امانت کی طرح انہیں سونپ دیا تھا جو ان کے وارث تھے۔ جن کا وہ خون تھے۔ میں کیا تھی؟ محض انہیں دنیا میں لانے کا ایک ذریعہ...... میں نہ ہوتی کوئی دوسری عورت ہوتی جو ایک مشین کی طرح یہ کام انجام دیتی اور میں نے بھی تو یہ ڈیوٹی پوری کرنے میں پورے تین سال لگا دیے۔ تین طویل سال جو صرف تمہاری ماں بہنوں پر بھاری نہیں گزرے۔ انہوں نے دن رات طعنے دے کر ان تین سالوں کو میرے لیے بھی ایک جیل کی طرح بنا دیا تھا اور جیسے ہی مصطفیٰ میری گود میں آیا تمہاری ماں نے اسے لے لیا۔ میں ماں بنی ضرور مگر ممتا کا کوئی احساس دل سے محسوس نہ کر سکی۔ چند دن مجبوراً دودھ پلانے کی غرض سے اسے میرے پاس لایا گیا پھر اوپر کے دودھ پر لگا دیا گیا اور مرتضیٰ کو تو میرے دودھ کی ایک بوند بھی نہ نصیب ہوئی۔ تمہاری بڑی بہن کا ہی فتویٰ تھا۔

''اس لاغر، بیمار، یرقان کی ماری عورت کا دودھ پلا کے کیا نسل خراب کرنی ہے؟ یہ تو ہمارے بچے کو خدانخواستہ سو بیماریاں لگا سکتی ہے۔''

مصطفیٰ کی طرح مرتضیٰ کا کاٹ بھی ابتدائی دنوں میں ہی دادی کے کمرے میں لگ گیا تھا۔ دو سالہ مصطفیٰ اب اپنی چھوٹی پھوپھی کے کمرے میں اس کے بستر پہ اس سے لپٹ کے سوتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں ان پرائی گودوں کے عادی میرے بچے مجھے ماں کی حیثیت سے جانتے کب تھے مجتبیٰ! ان کے نزدیک میں ایک ایسی عورت تھی جو ساتھ والے کمرے میں رہتی۔ صبح کا ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا اور شام کی چائے بنانے پہ مامور تھی۔ جس کو وہ اپنے گندے کپڑے دھونے کے لیے دے آتے یا دادی کا کوئی نہ کوئی کام بتانے کبھی آجاتے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ قدرتی طور پہ وہ محض زبانی ہی سہی مجھے مما کہہ کر بلاتے تو تھے۔ پھر اب کیا وجہ ہے جو میرے بغیر نہیں رہ سکتے؟ بقول تمہارے ''ان کی دادی اور پھوپھی ان کی پرورش اور تربیت میری نسبت کہیں بہتر طور پہ انجام دے سکتی ہیں اور دیتی آئی ہیں تو اب کیوں نہیں؟'' اوہ کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ دادی کو اب انہیں گود میں لٹا کے کہانیاں سنانے، لاڈ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اب ان کے کپڑے بھی دھونا پڑتے ہیں۔ پھوپھی کو نوالے بنا بنا کے منہ میں ڈالنے کے بجائے اب کھانا پکانا پڑتا ہے۔ یقیناً یہی بات ہوگی۔''

میں سوچتی رہی۔ کہہ نہ سکی۔ طعنے دینے کی عادت جو نہ تھی اس لیے میرے اندر کی بزدلی یہ کڑوے سچ اگلنے نہ دے رہی تھی۔

''میں تو سمجھتا تھا، تمہیں مجھ سے اور بچوں سے بہت محبت ہے پھر یہ کیسی محبت ہے نائلہ! جو وقتی طیش کی وجہ سے پل بھر میں ٹوٹ گئی۔ اتنا حوصلہ کیسے آ گیا تم میں کہ تم نے سارے رشتے توڑنے میں ذرا تامل نہ کیا۔ کیا یہ میری غلط فہمی تھی کہ تم اس رشتے کو برقرار رکھنے کی خاطر اور میری اور بچوں کی محبت میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہو؟ بس اتنا ہی حوصلہ تھا؟'' وہ سوال کر رہا تھا۔

''اللہ بھی بندے کو اس کی برداشت کے مطابق آزماتا ہے مگر تم نے تو میری برداشت اور صبر سے کہیں بڑھ کے مجھے آزمائشیں دیں۔ عورت کو کمزور بھی کہتے ہو اور اس سے اس درجہ مضبوطی کی امید بھی رکھتے ہو کہ وہ ہر ظلم وستم کے آگے سیسہ پلائی دیوار کی طرح جمی رہے۔''

''میں تمہارے بغیر بالکل ادھورا ہوں۔ بالکل ادھورا۔''

''اور میں تو تمہارے ساتھ رہ کے بھی ادھوری تھی۔''

''میں کیسے رہوں گا تمہارے بغیر؟''

''جیسے میں تمہارے ساتھ رہتی آئی تھی۔''

''اتنی مشکل زندگی گزارنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں؟''

''وہیں سے جہاں سے میری زندگی کو مشکل تر بنانے کے حربے سیکھ کے آتے تھے۔''

''تم کچھ بولتی کیوں نہیں نائلہ! مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر ہی تم چلی گئیں۔ بارہ سالہ رفاقت کو جھٹکے سے توڑتے ہوئے مجھ سے کوئی گلہ تو کرتیں میری صفائی تو سنتیں۔ کم از کم اب ہی میرے بندھے ہاتھوں پہ نظر ڈال لو۔ مجھے معاف کر دو نائلہ! خدا کا واسطہ ہے مجھے معاف کر دو۔''

''بالآخر وہ گڑگڑا اٹھا۔ میں نے حیرت سے اس کے جھکے سر برستی آنکھوں اور بندھے ہاتھوں کو دیکھا۔

یہ وہی شخص تھا جو میرے ساتھ ناروا سلوک کرنے پہ کبھی شرمسار تو درکنار افسردہ تک نہ ہوا تھا۔ اس کے نزدیک میرے ساتھ ہر طرح کا غیر انسانی سلوک جائز تھا۔ وہ اپنی ہر حرکت میں خود کو حق بجانب سمجھا کرتا تھا۔ آج اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میرے دل کو یکایک کچھ ہونے لگا۔ پہلی بار مجھے اپنے عورت ہونے پہ نفرت محسوس ہونے لگی۔ یہ میرا عورت پن ہی تو تھا جو مجھے ایک بار پھر نرم کر رہا تھا جبکہ میں پتھر ہونا چاہتی تھی۔ پتھر کے ساتھ رہنے کے لیے وجود پتھر سا ہی کرنا پڑتا ہے ورنہ کرچی کرچی ہونا تو لازم ہے۔ ایک بار شکستہ ہو کے بکھرنے کے بعد میں پھر سے ریزہ ریزہ ہونے کو تیار تھی شاید اسی لیے میرا دل پسیج رہا تھا۔

''تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے معاف کر دو۔'' وہ پھر کہہ رہا تھا۔

''میں نے ہمیشہ عورت کو پیر کی جوتی سمجھا۔ بلکہ جوتی کا بھی انسان کسی حد تک دھیان رکھتا ہے کہ وہ کارآمد چیز ہے جبکہ تمہیں میں نے اس سے بھی ارزاں سمجھا۔ میری ماں نے میری آنکھوں پہ پٹی باندھ رکھی تھی۔ نائلہ! میں صرف وہی سن پاتا جو وہ کہتی میں صرف وہی جان پاتا جو وہ بتاتی میں صرف وہی دیکھ پاتا جو وہ چاہتی تمہاری آواز میرے کانوں تک کیسے پہنچتی۔ تمہاری وجود مجھے نظر کیسے آتا۔ تمہار سسکیاں، تمہاری آہیں مجھ تک کیسے پہنچتیں میں تو پتھر کا ہو چکا تھا۔''

میں نے اور بھی حیران ہوتے ہوئے اس کے اعترافات سنے۔ وہ پتھر آج اپنے پتھر ہونے کو تسلیم کر رہا تھا۔ مان رہا تھا کہ وہ محض اپنے ماں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنا رہا۔ ایک ایسی ماں کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا جو نجانے کن تشنگیوں اور حسرتوں کے زیر اثر ایک نفسیاتی مریضہ بن چکی تھی اور جس کو صرف اور صرف مجھے تکلیف اور ایذا دے کر تسکین ملتی تھی۔ وہ ہمیشہ اسے یہ تسکین پہچانے کی خاطر مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر ٹارچر کرتا رہا۔

میرے خاموش دل سے ایک سرد آہ آزاد ہوئی۔

''ہاں دیر تو ہو گئی بہت دیر۔ اب تو ازالہ کرنے کا بھی وقت نہیں رہا۔ میں تمہارے اعتراف کا کیا کروں مجتبیٰ! جب کہ تلافی تک نہیں ہو سکتی۔''

''یہ قرض بے شک میں نہیں چکا سکتا۔ تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی بھی نہیں کر سکتا لیکن تمہارے اس طرح منہ پھیر کے جانے سے میں نے یہ سبق ضرور حاصل کیا ہے کہ اگر میں اسی طرح دوسروں

کے نظریہ سے جیتا رہا۔ اپنے دل کی آواز سننے کے بجائے اوروں کے کہے پہ چلتا رہا تو زندگی میں مزید نقصانات اٹھاؤں گا۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں نائلہ! اب میں مزید کسی کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننے کے لیے تیار نہیں۔''

''فیصلہ تو درست ہے مجتبیٰ۔ مگر کاش بروقت بھی ہوتا۔'' میں بے چین ہوگئی۔

''تم کچھ نہیں کہہ رہیں؟ ہاں میں جانتا ہوں تم کچھ نہیں کہو گی۔ مگر تم میری بات سن تو رہی ہونا؟ تمہاری اسی چپ نے ہی تو حالات خراب کیے رکھے تم مجھ سے کچھ کہتی بھی تو نہیں تھیں۔ میں اپنے آپ میں مست تھا، مدہوش تھا، تم نے بارہ سال تک چپ سادھے رکھی ایک بار بھی مجھے میری غلطیوں کا احساس نہ دلایا ورنہ شاید میرا ضمیر جاگنے میں اتنا وقت نہ لگتا اور جب تمہارا صبر ٹوٹا تب بھی تم نے حد کردی۔ صدیوں کی چپ سادھ لی۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ جن لوگوں کو میں سب سے بڑا سہارا جانتا تھا وہ بے معنی بودے سہارے نکلے۔ میری بہنیں جو مجھ سے لاڈ جتانے اور تمہاری کمزوریوں کو جتا جتا کر مجھ سے ہمدردی جتانے میں پیش پیش رہتی تھیں۔ تمہارے جانے کے بعد گویا اپنے گھر کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہفتوں میکے کی خبر نہیں لیتیں، اپنے بھائی کو دیکھنے نہیں آئیں کہ وہ کس حال میں ہے۔ اپنے بھتیجوں سے اتنے اتنے دن الگ آرام سے رہ لیتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ اب میکہ میں سر جھکا کے خدمتیں کرنے والی کوئی نہیں۔ میری ماں اب اپنے ان پوتوں سے نالاں ہے جن پہ وہ بلا شرکت غیرے حق جتایا کرتی تھی اب ان کو سنبھالنا اسے دوبھر لگتا ہے۔ میں جان گیا ہوں نائلہ! کہ زندگی میں ہمیشہ ساتھ نبھانے والا صرف ایک فرد ہوتا ہے۔ وہ جو میں اپنی نادانی کے ہاتھوں کھو چکا ہوں۔ اب میں یہ نادانی دوبارہ نہیں دھراؤں گا۔''

یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یا اللہ یہ کیوں میری بے بسی کو امتحان میں ڈال رہا ہے کیوں میری لاچاری کو آزما رہا ہے۔'' اس سے دل ہی دل میں سب کہہ چکنے کے بعد اب میں اللہ سے مخاطب تھی جانتی تھی کہ بس ایک وہی ذات پاک ہے جو مجھے سن سکتی ہے۔

''کیا اتنی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ کچھ نہیں بدل سکتا۔ اس کا بدلنا مجھے خوشی نہیں دے رہا۔ اس کے بدلنے سے بھلا اب مجھے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔ ہاں! اس کی یہ باتیں یہ اعترافات یہ سب میرا دل پھر سے موم ضرور کررہے ہیں۔ اور وہ میں نہیں چاہتی۔ کیونکہ پتھر بن کے جدائی سہنا بہت آسان ہے۔ اسی لیے تو یہ دو ماہ اتنی آسانی سے گزر گئے۔ جن سے نفرت دل میں جڑ پکڑ لے ان سے الگ ہونے پہ ملال کیسا؟ لیکن اندر سے نرم پڑتی مٹی سے پھوٹتی محبت کی یہ نئی کونپلیں میرا اگلا سفر کتنا کٹھن بنانے والی ہیں۔''

''تم نے جاتے جاتے مجھے محبت سکھادی نائلہ!'' اس کا اگلا اعتراف ان کونپلوں کو پل میں ہرا بھرا کر گیا۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ پھول جو وہ میرے لیے لایا تھا اور جن کی طرف میں نے نظر اٹھا کے بھی دیکھنا گوارا نہ کیا تھا اور جنہیں ہمیشہ کی طرح اس نے میرے سرہانے ڈھیر کردیا تھا وہ سارے گلاب اس

جھونکے کے ساتھ میری قبر کی گیلی مٹی پہ بکھر گئے۔ میرے مردہ اور گلتے سڑتے وجود کو گلاب کی مہک گئے دنوں میں کھینچنے لگی۔

''آہ......! مجتبیٰ! کیسے شخص ہو تم! جیتے جی تمہاری نفرتوں نے مجھے سکون نہ لینے دیا اور اب مرنے کے بعد تم مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تمہیں محبت کرنا آ گئی تاکہ موت کے بعد یہ محبت مجھے بے چین رکھے۔ تاکہ مجھے ہمیشہ ابد تک اپنی جلد بازی پہ افسوس رہے کہ تمہیں بدلنا ہی تھا تمہاری محبت تقدیر نے لکھ ہی رکھی تھی تو میں نے جانے میں جلدی کیوں کی؟''

''بس ایک بار تم مجھے معاف کر دو تاکہ میرے دل کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو۔ ایک بار نائلہ! ایک بار دل سے مجھے معاف کر دو۔ مجھے خود بخود پتا چل جائے گا۔ جب میرے دل سے یہ بھاری سِل سرکنا شروع ہو گئی تو میں سمجھ جاؤں گا۔ میری توبہ قبول ہو گئی۔ اللہ نے مجھے تمہاری بددعاؤں کے حصار سے آزاد کر دیا۔''

''میں نے صدق دل سے اسے معاف کر دیا۔ اللہ کو گواہ بنا کے اسے اپنی ہر بددعا سے آزاد کیا۔ اب میں اس قبر میں لیٹے لیٹے اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی تھی اس کے لیے۔ اس شخص کے لیے جس سے مجھے محبت تھی۔ اور جس سے مجھے بعد میں نفرت بھی ہوئی، اتنی شدید نفرت جس نے میری زندگی کو گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا اور پھر ختم کر دیا اور پھر وہی شخص جس سے مجھے ایک بار محبت ہو چکی ہے۔ میرا دل ایک بار پھر اس کی جانب کھینچ رہا ہے۔ لیکن اب میں پیچھے نہیں مڑ سکتی۔ بس اسے معاف کر چکی ہوں اور وہ میں نے بھیج دی۔''

دفعتاً میں نے اس کے اضطراب میں کمی آتے دیکھی۔ اس کے چہرے پہ چھائی وحشت چھٹ رہی تھی۔ شاید میرے دل کے صاف ہونے کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنی ہتھیلی میری قبر پہ پھیلائی اور دھیرے سے سہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ اپنی شادی شدہ زندگی میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔ نکاح جیسے پاک بندھن کو بہکاوؤں میں آ کے آلودہ نہیں کروں گا۔ میں جان گیا ہوں میاں بیوی کے تعلقات کو کیا باتیں خراب کرتی ہیں اب ایسا کچھ نہیں ہو گا نائلہ! کچھ نہیں یہ میرا وعدہ ہے۔''

''کیا یہ شخص پاگل ہو چکا ہے؟'' میں بے چین ہو گئی۔ ''سب جانتے بوجھتے ہوئے مکمل ہوش و حواس میں یہ ایسی بات کیسے کر سکتا ہے؟ اب ایسا کیسے ہو سکتا ہے اب یہ سارے وعدے کس کام کے۔''

''اگلے جمعے کو ایک سادہ سی تقریب میں، میں زوبیہ کے ساتھ نکاح کر رہا ہوں وہ میری کولیگ ہے۔ عرصے سے میرے ساتھ ہے مگر پچھلے کچھ دنوں سے خصوصاً جب سے تمہاری موت کے بعد میں ٹوٹا ٹوٹا بکھرا رہنے لگا تھا اس نے مجھے سنبھالا وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ وہ محبت جس کا احساس تمہاری خاموش ناراضی نے میرے بے حس دل کو دلایا تھا وہ محبت اس کے حصے میں آ گئی۔ وہ بہت محبت کرنے والی حساس اور پر خلوص

لڑکی ہے تمہارے بچوں کو ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دے گی۔ میرے خالی گھر کو اس کے وجود کی ضرورت ہے
مگر میں زندگی کے اس نئے سفر میں قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ تمہاری ناراضی نے دیے تھے
ہوئے تھے۔ مجھے تمہاری بددعاؤں سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے میں تم سے معافی مانگنے روز چلا آتا ہوں تاکہ
زوبیہ کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کروں تو دل پہ پچھلے ملال کا کوئی سایہ، پچھتاوے کا کوئی عکس باقی نہ ہو۔
تمہارے ساتھ روا رکھے سلوک کی کوئی سزا میرا پیچھا نہ کر رہی ہو۔ اب مجھے لگنے لگا ہے جیسے تم نے مجھے معاف
کر دیا ہے کیا میں سچ کہہ رہا ہوں نائلہ؟ یہ میری خوش فہمی تو نہیں۔ تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے نا؟''

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا اور اب تو میں انکار بھی نہیں کر سکتی تھی کیا کسی نے مرنے کے بعد، مرنے کے
ساٹھ دنوں بعد موت کی اذیت پھر سے محسوس کی ہے، وہ میں کر رہی تھی۔

وہ جا رہا تھا میری قبر پہ چند پھولوں کی پتیاں ڈال کر پانی کا چھڑکاؤ کر کے، میرے لیے فاتحہ خوانی کر
کے مجھ سے معافی مانگ کے اور میرے اندر پھر سے محبت جگا کر...... کیا کسی نے مرنے کے بعد محبت کی ہے وہ
میں کر رہی تھی آپ کہیں گے مرنے کے بعد کیسی محبت؟ کیسی نفرت؟ ایک مردہ وجود یہ احساسات کیسے بیان کر
سکتا ہے۔ لیکن آپ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے۔

کیا آپ نے کبھی مر کے دیکھا ہے؟

نہیں ناں۔ وہ تو بس میں۔

......❁......

بھڑاس

''مقبول!''

بیگم صدیقی کی آواز پہ اس کے بے تابی سے باہر کو جاتے قدم سست پڑے لیکن بجا ۔۔۔۔:
سوچنے لگا یونہی سنی ان سنی کر کے نکل جائے۔ اس وقت گھر پہنچنا زیادہ ضروری تھا اور بیگم صدیقی کو کونسا ضروری
کام ہوتے ہیں جواب ہوں گے۔ فضول وقت، فضول شوق۔

وہ نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اگلی آواز زیادہ کڑک دار آئی۔

''مقبول! کہاں جا رہے ہو؟''

شاید اس بار بھی وہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کر جاتا لیکن گیٹ کیپر نے گردن گھما کے اسے سوالیہ نظروں سے
گھورا جیسے ارادہ دریافت کر رہا ہو۔

''بیگم صاحبہ نے مجھے آواز دی ہے۔''

سٹپٹا کے وہ اس سڑے مزاج والے افغانی گیٹ کیپر کے سامنے دانت نکال کر خجالت بھرے انداز
میں پوچھنے لگا۔

''مقبول تمہارا نام اے ناں؟''

جواب ویسا ہی جلا بھنا تھا جیسا وہ خود۔

مرے مرے قدموں سے واپس پلٹا۔

''ایک آواز کیوں نہیں سنتے؟'' سجی بنی بیگم صدیقی نے دانت کچکچاتے ہوئے گھورا۔

''گاڑی نکالو۔'' وہ ہیل کی ٹک ٹک بجاتی دو سیڑھیاں نیچے اتریں۔ پیچھے ان کی سر چڑھی میڈ رنگین
چھتری ان کے سر پہ لیے ہوئے تھی تاکہ بارش کی بوندیں ان کے شیمپو اور بلو ڈرائی کیے بالوں کو خراب نہ کر دیں۔

وہ بیگم صاحبہ! مجھے گھر جانا تھا۔'' مقبول گھگھیایا۔

''کیوں، یہ کونسا وقت ہے گھر جانے کا؟ دوپہر کے دو بجے ہیں۔ تمہاری ڈیوٹی رات دس بجے تک ہوتی ہے۔''

یہ بھی محض مفروضہ ہی تھا ورنہ کبھی کبھی جو وہ اپنی ڈیوٹی کے وقت یعنی دس پونے دس بجے انہیں کہیں لے کر جاتا تو کبھی بارہ تو کبھی ایک ڈیڑھ بجے رات تک ان کے انتظار میں گاڑی میں پڑا سوکھتا رہتا۔

''وہ جی بارش ہو رہی ہے، زبیداں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے میں نے سوچا میں ہی جا کر۔''

''اس نے بچوں کو روٹی پکا کے کھلانی ہو گی۔'' بیگم صدیقی کی لاڈلی میڈم فوزیہ، جوان کے دل سے اترے تقریباً نئے کپڑے پہن کر گوارا حد تک میک اپ کر کے بنی ٹھنی اتراتی رہتی تھی، اٹھلا کے کہنے لگی۔

''بیماری بیوی کو چائے بنا کے پلانی ہو گی، اس کا سر دبانا ہو گا۔'' فوزیہ کی مسکراہٹ اور اس کا طنزیہ تبصرہ مقبول کو کڑوے گھونٹ کی طرح پینا پڑا کیونکہ وہ اس کی ہم منصب ہی سہی، ایک معمولی تنخواہ دار ملازمہ ہی سہی لیکن مالکن کی منظور نظر تھی اس وقت بھی وہ اس کی اس بات پہ آگ بگولہ ہونے کی گستاخی کیسے کر سکتا تھا، جس بات پہ بیگم صاحبہ مسکرا کے داد دے رہی تھیں۔

''جورو کی غلامی بعد میں کرتے رہنا، پہلے وہ کام کرو جس کی تنخواہ لیتے ہو۔''

''جورو کی تو۔'' ایک موٹی سی گالی اس کی زبان پہ آتے آتے رک گئی، اس نے معذرت طلب نگاہوں سے سامنے دیکھا۔

''معاف کرنا بیگم صاحبہ! جورو جائے چولہے میں سالی۔ مگر اسے نخرے بڑے آتے ہیں۔ رات ایک سو دو بخار تھا اور بس لیکن صبح ناشتے میں ایک چائے کا کپ مر مر کے بنایا۔ اب جو بارش نے قیامت پھیلائی ہو گی وہ اس ہڈ حرام سے کہاں قابو ہو گی۔ ویسے تو ہاتھ پیر کی پوری ہے۔ چھ دن پہلے جب بارش ہوئی تھی میں آپ کے ساتھ اسلام آباد گیا تھا، پیچھے اکیلی صحن میں سے پانی نکال نکال باہر کرتی رہی، نالیوں میں کپڑے ٹھونستی رہی، سامان اوپر تلے ڈھیر کرتی رہی لیکن طبیعت ذرا سی خراب ہو تو بہت ہچر مچر کرتی ہے، سر پہ کپڑا باندھے پڑی رہتی ہے گھر کا تو حشر ہو جائے گا۔''

''رہنے دو تم کون سے ایرانی قالین بچھے ہیں جو خراب ہو جائیں گے۔'' اس کی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں بیگم صدیقی نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

''گاڑی نکالو، مجھے باہر جانا ہے۔'' اس بار خاصے تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔

''لیکن جی وہ پیچھے بارش۔''

''اوہو، مقبول! تم اس وقت ڈیوٹی پہ ہو۔ پیچھے کی فکر کرنا چھوڑ دو۔ ویسے بھی نہ تو بارش اتنی طوفانی ہے نہ تمہارا گھر کچی مٹی کا بنا ہے جو بہہ جائے گا۔''

وہ سر جھکا کے رہ گیا۔ اب کیا کہتا گھر واقعی کچا نہیں تھا اور ایسی بارشیں بھی اس موسم میں معمول کی بات تھی لیکن وہ محلہ، وہ گلیاں جہاں وہ رہتا تھا وہ معمولی سی بارش کے نتیجے میں بھی جو ہڑ کھڑے کر دیا کرتیں۔

سڑکیں نئی بن جانے کی وجہ سے اونچی ہوگئی تھیں اور گھر پرانے بنے ہوئے تھے۔ وہ نیچے اور نیچے ہوتے چلے گئے اوپر سے سیوریج کا نظام گٹر پہلے ہی اُبلے رہتے، ہلکی سی بوندا باندی میں بھی بند توڑ کے گھروں کے اندر غلاظت پھیلا جاتے۔ سڑک پہ کھڑا پانی دو دو فٹ نیچے بنے گھروں میں داخل ہو جاتا۔ برسات کا سارا دن ہر گھر کے مکین اسی تگ و دو میں ہوتے کہ پرانے برتنوں میں بھر بھر کے پانی دوبارہ صحن سے سڑک پہ پھینکتے رہیں تاکہ کمرے نہ بھرنے پائیں اس مشقت میں گھر کے بچے تک شریک ہوتے لیکن پھر بھی گندے، بدبودار پانی کی تبارہ کاریاں کمروں تک پہنچ ہی جاتیں۔

آج صبح آسمان پہ چھائی کالی بدلیاں دیکھ کے زبیداں نے تاکید کی تھی۔

''جھڑی لگتے ہی گھر کا چکر لگا لین، مجھے تپ چڑھا ہے میں اوپر چھت پہ جا کر کیسے بھیگوں، کیسے پرنالے کا منہ بند کروں، دونوں بچے اکیلے کب تک لگے رہیں گے، آجانا۔''

اسے بھی اس دری کی بڑی فکر تھی جو پچھلے مہینے بائیس سو روپے کی لی تھی، گلی میں کاندھے پہ لاد کے پھرنے والے پٹھان سے اور بیٹھک میں بچھائی تھی۔ دو کمروں والے گھر کا یہ کمرہ اس رنگین شوخ پھولوں والی دری سے سج کے سچ مچ بیٹھک لگنے لگا تھا۔ زبیداں نے چاؤ سے دری کے رنگ کے کپڑے کے پھول بھی سجا ڈالے تھے گلدان میں اور پرانے صوفے کی گدیوں پہ نئے غلاف بھی چڑھا دیے تھے۔ اس بائیس سو کی دری نے بیٹھک میں نئی شان پیدا کر دی تھی۔ پہلی بار تو اکٹھے اتنے روپے ایک ہی چیز کی خریداری پہ خرچ کر ڈالے تھے۔

وہ گاڑی آگے نکال کے لایا تو بیگم صدیقی نزاکت سے اپنی ساڑھی دو انگلیوں کی مدد سے اٹھا کے سیڑھیاں نیچے اتریں۔ پیچھے پیچھے چھتری تانے فوزیہ تھی۔

''میڈم! میں ساتھ چلوں؟''

اپنی میڈم کے صاف جواب پہ مقبول نے اس کے چہرے پر اطمینان پھیلتا محسوس کیا۔ یقیناً اس نے یہ پیشکش اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے کی تھی ورنہ اس نک چڑھی مغرور بدمزاج عورت کے ساتھ چپکے رہنے کا شوق کس کو ہو سکتا ہے۔ یوں تو فوزیہ بھی کم بدذات نہیں تھی لیکن کبھی کبھی مقبول کو یہ سوچ کر اس پہ ترس آنے لگتا کہ بیگم صاحبہ سے اس کا سامنا سارے دن میں دو یا تین بار ہوتا ہے کہیں لے جانے کے لیے یا واپس لانے کے لیے راستے بھر وہ خاموش ہی رہنا پسند کرتیں اور یہ خاموشی غنیمت تھی۔ اس کے باوجود اس دورانیے میں مقبول کو اپنا آپ سولی پہ ٹنگا محسوس ہوتا۔ اسے اپنے مقابلے میں صاحب کا ڈرائیور مزے میں لگتا بھلے صاحب گالیاں دیتا ہے، نشے میں دھت کبھی کبھی دو چار لپڑ بھی دے مارتا ہے مگر کیا ہوا؟ مرد ہے۔ ایک عورت کے آگے بھیگی بلی

بنے جی حضوری کرنا کتنا مشکل ہے یہ کوئی مقبول جیسے مرد سے پوچھے اور بے چاری فوزیہ ہاں کبھی کبھی وہ بے چاری ہی تو لگتی، سارا دن اسے اپنی میڈیم کی للو چپو کرنا پڑتی، سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے رہنا پڑتا اور مزے کی بات یہ ہے کہ مسکراتے ہوئے، نثار ہوتے ہوئے بھئی بڑی ہمت ہے تیری۔

اس نے دل ہی دل میں اسے داد دی اور بیک ویو مرر سے ایک دزدیدہ نظر پیچھے بیٹھی بیگم صدیقی پہ ڈالی۔

انہوں نے سر سیٹ کی پشت سے ٹیک رکھا تھا۔ آنکھیں موندی ہوئی تھیں شاید وہ اپنی پسند کی ان غزلوں والی کیسٹ میں گم تھیں جو مقبول کو زہر لگتی تھی۔ اس نے چھپا کے اپنے کیسٹ بھی رکھے ہوئے تھے، عطاء اللہ نیازی، مراتب علی اور نصیبو لال کے، جب ان کا انتظار کرنا ہوتا یہی کیسٹ نکال کے لگا لیتا اور ایسے ہی سر ٹیک کے آنکھیں موند لیتا جیسے انہوں نے موندی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ کبھی بھی ایسی بے فکری خود پہ طاری نہیں کر سکتا تھا جو ان بیگم صاحبہ کے پاس تھی۔ آنکھ بند کرتے ہی کہاں کی واہی تباہی، لعنتی فکریں حملہ کر دیتیں۔ کبھی کرایہ دینے کی فکر کبھی فیس کی آخری تاریخ، کبھی فلاں کا قرضہ، کبھی ڈھمکاں خرچہ اور یہاں کیا شان ہے۔ صراحی دار دودھیا گردن کچھ اور لمبی لگ رہی تھی، ہر سانس کے آتے جاتے سینے میں پڑی موٹی سی سونے کی چین چمک جاتی اور اس میں جڑا یہ موٹا سا ہیرا لشکارے بکھیر دیتا۔ اے سی بند تھا اور گاڑی کے شیشے اترے ہوئے تھے بارش کے ساتھ چلنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اندر آ کے سارا ماحول ٹھنڈا ٹھار کر رہی تھیں۔

مقبول کی نظر بار بار پھسل کے اس کے چکنی گردن پہ اور بے اختیار اس کا دل اس پہ ناخنوں سے کھرونچیں مارنے کو چاہتا۔ پتا نہیں اس عورت کو دیکھتے ہی اس کے اندر کا وحشی جاگ کیوں جاتا تھا۔ شکر ہے کہ جاگنے کے بعد بھی ہوش بے قابو نہیں ہوتے تھے جو کرتا تصور میں ہی کرتا ورنہ۔

''جانا کہاں ہے بیگم صاحبہ؟''

اگرچہ گھر سے نکلتے ہی انہوں نے باور کرا دیا تھا کہ وہ صرف لانگ ڈرائیو کا مزہ لینا چاہتی ہیں مگر وہ آدھے گھنٹے میں ہی اکتا گیا اور پوچھنے لگا۔

''کہیں نہیں، عرصے بعد تو ایسا موسم ہوا ہے ورنہ بارش کے ساتھ حبس اور گھٹن ہو جاتی ہے۔ ہا...... یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کتنی اچھی لگ رہی ہے ہوا اور یہ بوندیں۔''

انہوں نے اپنی گلابی ہتھیلی ذرا سی باہر کر کے ٹھنڈی بوندیں محسوس کیں اور پھریری لے لی۔

''تیرے موسم کی ایسی کی تیسی۔'' وہ پھر دل میں اسے کئی قسم کی گالیوں سے نوازنے لگا۔

سڑکوں پہ فٹ فٹ کھڑا پانی اسے دہلا رہا تھا۔

''ایسی چوڑی، صاف اور نئی سڑکوں پہ اتنا پانی؟ تو پھر میرے محلے میں کتنا ہوگا؟ کمر کمر تک بندہ ڈوبتا ہوگا بچے تو منہ تک پتا نہیں سکول سے کیسے واپس آئے ہوں گے۔''

اسے اب بچوں پہ غصہ آنے لگا جو اس کے منع کرنے کے باوجود اس خراب موسم میں سکول چلے گئے تھے۔

''کیا کر رہی ہو گی زبیداں؟'' اس کا ذہن گھوم پھر کے وہیں چلا جاتا۔

''پہلے تو باورچی خانے کا سامان ٹھکانے لگایا ہو گا مگر کیسے؟ دو چھتی خاصی اونچی ہے، میری مدد کے بغیر آٹے کا کنستر اور دوسرا سامان کیسے رکھا ہو گا خیر کچھ نہ کچھ تو کیا ہو گا اور دری، ہاں لپیٹ کر اٹھا دی ہو گی مگر مگر رکھی کہاں، ہاں بستروں والی پیٹی پہ اوہو، بستروں والی پیٹی کے پیندے میں بھی زنگ لگ گیا ہے۔ کھو کھلی ہو گئی ہے، پانی نیچے سے اس کے اندر چلا جاتا ہے اور زبیداں کے جہیز کے سنبھال کر رکھے لحافوں اور گدوں کو خراب کر دیتا ہے۔ اس نے کہا بھی تھا کہ اگلی بارش سے پہلے پہلے اس کا انتظام کروں مگر......''

اچانک گہرے پانی میں چھپے سپیڈ بریکر کی وجہ سے گاڑی دھچکے کے ساتھ اچھل کے رہ گئی۔

بیگم صدیقی نے ایک خوفناک سی چیخ ماری۔ شکر ہے اگلی گاڑی خاصے فاصلے پہ تھی اور پیچھے سے دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''جاہل انسان! دیکھ کے ڈرائیونگ نہیں کر سکتے، پتا نہیں کس نے تمہیں اس نوکری پہ رکھا ہے بدتمیز۔''

وہ جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا، جس محلے میں پل کے جوان ہوا تھا وہاں دوست یار مذاق مذاق میں بھی ماں بہن کی گالیاں ٹھونک دیا کرتے تھے اور وہ ہنس کے سہہ جاتا تھا مگر اس عورت کے منہ سے نکلے یہ دو لفظ، جاہل اور بدتمیز بھی اسے سنگین سے سنگین گالی سے بھی بدتر لگے۔ اس نے کڑوے گھونٹ کی طرح اسے اپنے اندر اتارنا چاہا مگر اس سے اس کے اندر پھیلی تلخی میں اور بھی زہر گھل گیا۔

''ابھی ایکسیڈنٹ ہو جاتا آنکھیں استعمال کروں۔''

''سپیڈ بریکر پانی کے اندر تھا، نظر نہیں آیا بیگم صاحبہ!''

وہ ایک لاتعلق سی ''ہونہہ'' کر کے چپ رہ گئیں۔

اس کے بعد مقبول نے جان بوجھ کے دو چار جھٹکے اور دیے جب سڑک پہ کھڑا گندا پانی اچھل کے بیگم صدیقی کی نفیس قیمتی ساڑھے تک آیا تو انہوں نے گھر واپسی کا آرڈر دے دیا۔

''فضول ملک...... بے کار جہاں انسان موسم بھی انجوائے نہیں کر سکتا۔''

وہ ٹشو پیپر سے چہرے پہ آئے چھینٹے رگڑ کے صاف کر رہی تھیں۔ مقبول کے اندر پھر سے اسے دھن کے دکھ دینے کی خواہش جاگ اٹھی۔ اس کے ایک جیسے، ہموار اور موتیوں کے سے چمکتے دانت، ایک ایک کر کے ٹھک سے نکال دینے کو جی چاہا۔ اس کو کسی پہیے کے نیچے دے کر کچل دینے کو جی چاہا اور اس کٹے بال یہ بال تو مٹھیوں میں بھر کے ایسے ایسے جھٹکے دوں کہ دماغ ٹھکانے آ جائے نواب زادی کا۔

جس وقت وہ گاڑی پورٹیکو کی جانب لے جا رہا تھا، عین اسی وقت صاحب اندر سے نکل کر اپنی گاڑی

میں بیٹھتے نظر آئے۔ اپنی بیگم کو دیکھ کر رک گئے۔ مقبول نے گاڑی ان کے برابر کھڑی کی اور نکل کر سلام جھاڑا۔

''آپ اس وقت یہاں؟''

وہ بنی سنوری، خوب ہر ہتھیار سے لیس سامنے کھڑی تھی مگر صاحب کی نظریں اس کی بجائے اپنی چالیس لاکھ کی نئی چمچماتی گاڑی پہ ناقدانہ انداز سے پڑ رہی تھیں۔ بیگم کی بہ نسبت صاحب جنم جنم کے رئیس نہیں تھے۔ انہوں نے یہ سب ایک عمر کی محنت سے حاصل کیا تھا اس لیے اس میں وہ خاندانی اور جدی پشتی امیروں والے چونچلے نہیں تھے، نوٹ خرچ ضرور کرتے تھے۔ مگر پھونکتے نہیں تھے۔ گاڑی پہ لگے کیچڑ کے داغ اور گیلی ہوتی سیٹ ان کے ماتھے پہ شکن لے آئی۔ انہوں نے بیوی کے سوال کا جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

''کار سروس کروا کے لاؤ...... ابھی، اسی وقت۔''

کھردری آواز میں دیے اس حکم نے مقبول کو اور پتا دیا۔ اللہ اللہ کر کے تو واپسی کا سبب بنا تھا۔

''صاحب! کیا فائدہ دھلوانے کا، راستے گندے پانی اور کیچڑ سے بھرے ہوئے ہیں، واپسی پہ پھر وہی حال ہوگا۔''

بروقت یہ بہانہ کام آیا۔

''الو کے پٹھے، تمہیں پہلے نہیں پتا تھا کہ اس موسم میں کار نکالتے ہوئے اس کا حشر کیا ہوگا۔''

صاحب کے گرجنے پہ اس نے کلستی ہوئی نظر نزدیک کھڑی بے نیاز سی بنی بیگم صاحبہ پہ ڈالی۔

''بیگم صاحبہ کو لے گیا تھا۔'' (کوئی اپنے کام سے نہیں نکالی تھی تمہاری چالیس لاکھ کی موٹر، بھینسے)

اس جواب پہ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کے چلے گئے۔ مقبول کو تاؤ آ گیا۔

''نامرد سالا...... زن مرید! ہوتا میں تو وہ دے دھنا دھن مار لگا تا جورو کو کہ عقل ٹھکانے آ جاتی۔ وقت بے وقت سیر سپاٹے سوجھ رہے ہوتے ہیں۔''

اس نے زمین پہ تھوکا۔ دل میں بیگم صدیقی کی دھنائی کر کے ارمان اور منہ زور ہو گئے۔

''کاش اللہ ایک دن ایسا معجزہ دکھا دے...... یہ بس ایک دن کے لیے میری گھر والی بن جائے، اسے پتا لگ جائے گا کہ مرد ہوتا کیا ہے، خصم کہتے کسے ہیں۔ یہ تو اب تک پیروں میں لوٹنے والے کتے کو ہی اپنا مرد سمجھتی ہے، اسے وہ چار چوٹ لگاؤں کہ مزا آ جائے مگر وہ میری بیوی ہوتی تب نا پتا نہیں یہ صاحب اسے گھما کے دیتا کیوں نہیں۔ ویسے تو بڑا سانڈ بنا ہوا ہے۔''

گھر پہنچا تو حشر وہی تھا جو سوچا تھا۔

بارش کا پانی گٹر کی غلاظت کے ساتھ گھر کے صحن میں جمع تھا۔ دونوں کمرے کے آگے زبیدہ نے دو دو اینٹ کھڑی کر کے آڑ بنا دی تھی لیکن پانی شاید اسے پھلانگ کے اندر جا چکا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب پانی

صرف صحن ہی میں موجود تھا، صرف کمروں کی ابتر حالت اور کونے میں اوپر تلے لگائے سامان کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا۔ بدبو ناقابل برداشت حد تک پھیلی ہوئی تھی۔

"بچے آئے کیا؟"

"نہیں تو کیا شام پانچ بجے تک تمہاری اماں کے سر پہ مدرسہ کھول کے بیٹھے ہیں۔"

وہ توقع سے کہیں زیادہ جلی بھنی بیٹھی تھی۔ دوپٹے سے کس کے باندھے سر پہ ہاتھ رکھے رکھے اس نے چبا کر کہا۔

"بکواس بند کر۔" وہ کون سا باغیچے سے کلیاں چن کے آرہا تھا جو اس پہ نچھاور کرتا۔ بیگم صدیقی کی وجہ سے اٹھائی جانے والی کوفت انہی تھکے ہارے شانوں پہ لاد کے گھر لوٹتا تھا اور آ کر زبیداں کے سر پہ پٹخ مارتا۔

"ہڈ حرام چھت پہ چڑھے کیا کر رہے ہیں؟" اوپر سے بچوں کی آتی آوازوں پہ اس نے چلا کے کہا۔

"کتابیں، کاپیاں اور بستے سکھا رہے ہیں بدنصیب اور کیا...... چھترے اڑائیں گے۔ سارے بستے کا ناس مارا گیا بھیگ کے۔"

"اور یہ، یہ گھر کیا حشر ہوا ہے؟" وہ بے نتھے بیل کی طرح دونوں کمروں میں گھوم گھوم کے ڈکرانے لگا۔

"ساری دری بھیگ کے برباد ہو گئی، اب میرے پہ احسان کرنے کے لیے اسے لپیٹ کر پیٹی پہ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ گیلی ہونے سے پہلے اٹھا لیتے موت پڑتی تھی کیا؟"

"میں اکیلی ذات کیا کیا کرتی۔" وہ بھی تنک کے کھڑی ہو گئی۔

"کتنا کہا تھا کہ آج دوپہر کو ایک چکر مار لینا، بارش دبا کے ہوئے گی مگر تم نہ آئے۔"

"ہاں، جیسے نوکری سے اٹھ کے آجانا میرے اختیار میں تھا۔ چھٹی نہیں دی مالکوں نے، اب کیا ان کے منہ پہ تھوک کر آجاتا۔ ویسے تو تُو بڑی مسٹنڈی، دس پہ بھاری بنتی ہے، یہ چار چیزیں نہیں اٹھائی گئیں تجھ سے؟ یوں کہہ کہ مرد کی کمائی کا درد ہی نہیں ہے۔ اجڑے چاہے برباد ہو، تیری بلا سے۔"

"تو بچے...... بچوں کو نہ لاتی۔ اس دری کو ہی کلیجے سے لگا کے چومتی رہتی۔ تم تو اب آگئے جب پانی آدھا اتر گیا۔ جب دیکھتے کہ کمر سے بھی اونچا تھا۔ چھوٹے کو کاندھوں پہ بٹھا کے اور باقی دونوں کو کمر سے لگا کے پانی میں سے نکال کے لائی تھی۔ گھر سنبھالنے بیٹھ جاتی تو یہ اکیلے نکل گئے ہوتے روز کی طرح اور کسی کھلے گٹر میں گر جاتے چھوٹا تو ڈوب ہی جاتا اتنے پانی میں۔"

مقبول کو دری سے بچے زیادہ عزیز تھے۔ اس ہولناک منظر کشی سے وہ تھرا گیا، مگر اس کا غبار بھی زبیداں پہ نکلا۔

اس نے دے تانبے کا گلاس زمین پہ مارا۔

''اے ہے......لو الٹی کھوپڑی۔'' زبیداں سارے دن کی تھکی ہاری، اوپر سے بیمار اور بے زار بھی اس الزام پہ بالکل ہی اکھڑ گئی۔

''خود کیا کرایا کچھ نہیں، الٹا میرا کیا کرایا کنویں میں ڈال رہا ہے۔''

''کچھ کھانے کو ہے تو لا۔''

''باورچی خانے کی موری ابل کے باہر آ گئی۔ بڑے کپڑے لیرے گھسا کے بند کی ہے۔ پہلی بوند پڑتے ہی آٹے کا کنستر، دالوں کے ڈبے، گھی کا ڈول سب دوچھتی پہ چڑھا دیا۔ پکاتی کیا؟ اوپر چھت پہ مٹی کے تیل والا چولہا پہنچایا ہے۔ لڑکی چائے بنا کے بھائیوں کو پاپے کے ساتھ کھلا رہی ہے۔ تم بھی جا کے کھالو۔''

اس نے پہلے سے پھیلے ہوئے بستر پہ جگہ بنا کے تکیہ سیدھا کیا اور کسی نہ کسی طرح اس پہ دوہری ہو کے لیٹ گئی۔

مقبول بیٹھا خونخوار نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ تکیے پہ رکھا سر......سر پہ بندھا دوپٹہ بند پلکیں گردن سے چپکے بال اس منظر پہ ایک اور منظر حاوی ہو گیا۔

''سیٹ کی پشت سے ٹیک کر رکھا سر......ٹھنڈی ہوا سے اڑتے بال بند پلکیں لانبی صراحی دار گوری گردن سونے کی چین کے ہلارے ہیرے کے لشکارے اور اس کے اندر کے وحشی کی وہ خواہش، وہ منہ زور خواہش۔

یکا یک پیروں تلے کچھ روندنے ہاتھوں سے کچھ مسلنے کی چاہ نے ایک بار پھر اس پہ غلبہ پا لیا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح لپکا نہ یہ سانولی، میل سے بھری موٹی گردن وہ تھی نہ یہ تعویذ کا کالا دھاگہ سونے کی وہ موٹی زنجیر تھا، نہ ہی یہ زبیداں، بیگم صدیقی تھی مگر وہ بیگم ہی کی طرح اس وقت اس کے اندر کا وحشی پن چھیڑ چکی تھی اس لیے مقبول نے خوب خوب اپنے دل کے سارے چاؤ پورے کیے۔

ساری بھڑاس نکال دینے کے بعد وہ نڈھال ہو کے ایک جانب پڑ گیا اور طمانیت سے زبیداں کی سسکیاں اور کوسنے سنتا رہا۔

☆

صبح وہ نظریں جھکائے آرام سے ناشتہ کرتا رہا۔ زبیداں کی بڑبڑاہٹ اسے سنائی دے رہی تھی مگر وہ ان سنی کر رہا تھا۔

''نصیب میں بنا کسی قصور کے مار لکھی ہے۔ ہائے رہا ہڈی ہڈی ہلا کے رکھ دی، میں تو مارنے والے کے ہاتھ ٹوٹنے کی بھی بددعائیں نہیں کر سکتی۔ میرے ہی بچوں کی دال روٹی رکے گی......روز کا کام بن گیا ہے اب تو......تھک ہار کے باہر سے آنا اور میری پٹائی کرنا مرجاؤں گی، ایک دن پھر بیٹھے بچے پالتے رہنا اور اپنی اس دری کی دھول چاٹتے رہنا جس کے پیچھے مجھے ادھیڑ ڈالا۔''

چائے کا آخری گھونٹ بھر کے مقبول نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے دیکھا۔ زبیداں کی گردن پہ اس کے ناخنوں کے نشان صرف نظر آ رہے تھے۔

☆

"بس واپس موڑ لو۔"

"جی کدھر؟"

"گھر......اور کہاں۔"

"دماغ پھرا ہوا ہے اس عورت کا۔" اس نے یوٹرن لے کر گاڑی دوبارہ گھر کے رستے میں ڈال دی۔

"بیگم صاحبہ! کوئی چیز رہ گئی ہے گھر؟"

"تمہیں جتنا کہا ہے، اتنا کرو۔" رکھائی سے جواب دے کر وہ باہر دیکھنے لگیں۔ آج انہوں نے شانوں سے نیچے آتے آویزے کانوں میں لٹکا رکھے تھے اور گدی پہ موٹا سا مصنوعی جوڑا اٹانک رکھا تھا۔ مقبول کا دل چاہا زور سے اس نقلی بالوں والے جوڑے کو نوچے اور ان لٹکتے آویزوں سے جھولے لیتا گزرے ایسے زور کے جھولے کہ بیگم کی چیخیں نکل جائیں۔

گھر سے کیا بابنگ دہل اعلان کر کے نکلی تھی کہ آج لمبی چوڑی شاپنگ کا ارادہ ہے۔ رات سے پہلے واپسی نہیں ہوگی۔ اس کی دو گھنٹے کی شاپنگ دوسرے بندے کی صبر کی حد ختم کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی، رات تک کون بھگتتا اسے اسی لیے فوزیہ نے تکلفاً بھی ساتھ چلنے کی پیشکش نہ کی اور نہ ہی بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ یہ ایک حیرت انگیز امر تھا کیونکہ شاپنگ یا بیوٹی پارلر کے لیے جاتے ہوئے وہ فوزیہ کا دم چھلا ضرور ساتھ لگاتی تھیں۔ آج شاید کوئی خاص شاپنگ تھی۔ مقبول ذہنی طور پر ایک تھکا دینے والے اکتاہٹ بھرے کام کے لیے تیار ہو گیا لیکن بیگم صاحبہ نے نزدیکی مارکیٹ کے ایک سپر اسٹور کے آگے گاڑی رکوائی، پندرہ بیس منٹ نجانے کیا الا بلا خریدتی رہیں، چھ سات بڑے بڑے شاپر لا کے ڈگی میں رکھوائے اور بیٹھتے ہی گھر واپس جانے کا آرڈر دے دیا۔

آج پھر صاحب کی گاڑی اندر موجود تھی۔ بیگم صدیقی تن فن کرتی اتریں اور آندھی طوفان کی طرح اندر چلی گئی۔ مقبول منتظر ہی کھڑا رہ گیا کہ وہ اس کے بارے میں کوئی نیا آرڈر دیتی۔ ابھی کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ گاڑی میں بیٹھ کے بیگم صاحبہ کا انتظار کرے۔ چابی گھما کے باہر گیٹ کیپر کے ساتھ بیٹھ کے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا گپ لگائے یا سب چھوڑ چھاڑ چپکے سے گھر کے لیے سرک جائے کہ اندر سے کچھ عجیب سا شور باہر کی طرف آتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ گیٹ پہ بیٹھا افغانی چوکیدار، کیاریاں صاف کرتا مالی اور نزدیک کھیلتے اس کے بچے بھی سامنے متوجہ ہو گئے۔

بیگم صاحبہ فوزیہ کو بازو سے کھینچے باہر لا رہی تھیں۔ مین ڈور کے سامنے نیچے اترتی سنگ مرمر کے چار چوڑی چکلی سیڑھیوں کے اوپر کھڑے ہو کے اس نے فوزیہ کو ایک زور کا دھکا دیا۔

''نکل جا حرام خور، نمک حرام! آئندہ اس علاقے میں تیری صورت بھی نظر آئی تو تیزاب پھنکوادوں گی۔''

پیچھے پیچھے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بے تاثر چہرے کے ساتھ صاحب بھی نمودار ہوئے۔

''اندر چلو، کیا تماشا لگا رکھا ہے؟''

اس نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے اپنی بیوی کو بازو سے دبوچا اور اندر لے جانا چاہا۔

''تماشا تو اب لگے گا...... میں بتاؤں گی تمہیں کہ......''

مگر صاحب نے نہیں کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی اور پاؤں کی ٹھوکر سے لکڑی کا منقش دروازہ ٹھک سے بند کر دیا لیکن اس سے پہلے انہوں نے اپنے ڈرائیور کو آنکھ سے کوئی اشارہ بھی کر دیا تھا۔ وہ لپک کے آگے بڑھا۔ نچلی سیڑھی پہ گری فوزیہ کو اٹھنے میں مدد دی اور گاڑی میں ڈال کے شاید اس کے گھر چھوڑنے کے لیے نکل گیا۔

سب ملازمین معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مالی سے یہ چٹ پٹا قصہ اکیلے ہضم نہ ہو رہا تھا اس لیے وہ اسے اپنی بیوی کو بتانے کوارٹر کی طرف بھاگا۔ افغان گیٹ کیپر نسوار کی چٹکی داڑھ کے نیچے رکھتا ہوا اپنی زبان میں نجانے کیا بڑبڑانے لگا۔ مقبول کے اندر کھد بد لگی تھی کچھ سوچ کر اس نے ڈگی میں سے بیگم صاحبہ کی خریداری کے تھیلے نکالے اور جھجکتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔ کوٹھی کے اندر جانے کا اسے بہت کم موقع ملا تھا ابھی بھی وہ سن گن لینے کے ارادے سے جا رہا تھا کہ اندر کسی ملازمہ سے اصل قصہ اگلوانے کی کوشش کرے گا حالانکہ اصل بات سامنے تو آ ہی چکی تھی پھر بھی جزئیات کے ساتھ سننے کا اپنا ہی چسکا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صاحب کے کمرے سے ان کے جھگڑے کی آوازیں ہی آ رہی ہوں۔ اس نے ایک نظر دیکھ کے ہی بھانپ لیا تھا کہ وہ فل نشے میں تھے ایسے میں احتیاط کا خیال کیا خاک رکھتے۔ دونوں خوب گرج رہے ہوں گے، بیگم کون سا کم غصیلی اور منہ زور ہے۔

لیکن اندر ہونے والا تماشا اس کی توقع کے برعکس تھا یا یوں کہیے، توقع سے بہت زیادہ تھا۔ جھگڑا چالو تھا مگر بند کمرے میں نہیں گول کمرے کے بیچوں بیچ سب نوکروں کے سامنے زمین پہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کرچیاں تھیں۔ گدیوں کی روئی بکھری ہوئی تھی نوکر پردوں، میزوں اور دراوازوں کی آڑ لیے سہمے کھڑے تھے مگر اس منظر سے محروم بھی نہیں رہنا چاہتے تھے۔ سب پر ہنٹر چلانے والی بیگم صاحبہ اس وقت نشے میں دھت اور غصے سے بے قابو ہوتے صاحب کے رحم و کرم پہ تھیں۔

مقبول نے ایک جانب شاپرز کا ڈھیر لگایا اور ایک طویل آسودہ سانس بھر کے باہر نکل گیا۔

☆

بہت دنوں بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ سرِ شام گھر لوٹ رہا تھا ورنہ ہوتا یہ تھا کہ بیگم صدیقی کو شام گھر پہ گزارنے کی عادت نہ تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بھی خوار ہونا پڑتا تھا۔

اس نے حلوائی کے پاس کھڑے ہو کے گرم گرم سموسے اور جلیبی تلوائے۔ پیالہ بھر کے کھیر بھی نکلوائی، بچوں کے لیے جوس کے اور چپس کے پیکٹ بھی خریدے۔

''او نیک بخت، کدھر ہے؟'' اندر داخل ہوتے ہی اس نے آواز لگائی۔

''اپنے بخت چولہے میں جھونک رہی ہوں اور کیا؟'' زبیداں نے حسب معمول اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ خلافِ معمول شوہر کو جلدی گھر آتا دیکھ کے اس کا موڈ اور خراب ہو گیا یعنی اب زیادہ دیر تک اس کی جان سختی میں رہے گی۔

''ارے چھوڑ چولہا چکی، رہنے دے کھانا وانا...... رات کو باہر سے نان کباب منگوا لیں گے یا باہر جا کے کھا لیں گے۔ بس تو دو کپ چائے بنا کے کمرے میں لے آ۔ تیری پسند کی ساری چیزیں لایا ہوں۔''

بچوں کو ان کے حصے کا سب کچھ دے کر وہ پہلے ہی چھت پہ رخصت کرا چکا تھا۔ زبیداں بڑی حیرت زدہ سی باورچی خانے سے نکلی۔ وہ خود ہی لفافے کھول کھول کر پلیٹوں میں سامان نکال رہا تھا

''اور یہ رہے تیرے گجرے۔''

اس نے مہکتے گجرے اس کے لہسن کی باس سے بھرے ہاتھوں پہ لپیٹ دیے۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں گڈو کے ابا!''

وہ بے یقینی سی تھی۔ گھر آتے ہی چیزیں اٹھا کے پٹخنے والا، گالم گلوچ کرنے والا اس کا شوہر آج کچھ اور ہی چیز لگ رہا تھا۔

''ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ اس کی گردن پہ لگی اپنے ناخن کی کھرونچیں سہلانے لگا۔

''تو پھر کیا لاٹری نکل آئی ہے۔''

''لاٹری تو نہیں...... مگر بڑے عرصے میں من میں دبی مراد ضرور پوری ہوئی ہے لے منہ میٹھا کر۔''

اس نے جلیبی اس کے منہ میں ٹھونسی اور بڑا سرشار سا قہقہہ لگایا۔

......❀......